محرم الحرام ۱۴۳۸ھ
اکتوبر ۲۰۱۶ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

یقین: روحِ سعی و عمل

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعی رجوع الی القرآن بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات:360، قیمت 475 روپے

حصہ دوم سورۃ آلِ عمران تا سورۃ المائدہ
صفحات 321، قیمت 425 روپے

حصہ سوم سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ
صفحات 331، قیمت 425 روپے

حصہ چہارم سورۃ یونس تا سورۃ الکہف
صفحات 394، قیمت 485 روپے

حصہ پنجم سورۃ مریم تا سورۃ السجدۃ
صفحات 480، قیمت 575 روپے

حصہ ششم سورۃ الاحزاب تا سورۃ الحجرات
صفحات 484، قیمت 590 روپے

حصہ ہفتم سورۃ قٓ تا سورۃ النّاس
صفحات 560، قیمت 650 روپے

یکے از مطبوعات: انجمن خدام القرآن خیبر پختونخوا پشاور
شائع کردہ: مکتبہ خدام القرآن لاہور
K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۡ (المائدۃ: ۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد :	65
شمارہ :	10
محرم الحرام	1438ھ
اکتوبر	2016ء
فی شمارہ	30/-

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرونِ ملک	300 روپے
بھارت و بنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501

فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org

ای میل برائے ادارتی امور: publications@tanzeem.org

ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو، لاہور

فون: 36316638 - 36366638

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال 5

وزیر اعظم پاکستان کا جنرل اسمبلی میں خطاب — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن 9

سورۃ الشعراء (آیات ۱۷۶ تا ۲۲۷) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

حقیقتِ دین 23

یقین: روحِ سعی و عمل — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

زادِ راہ 37

تقویٰ کا لباس — ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

تذکّر و تدبّر 61

قرآن کریم کی اُصولی باتیں (۱۳) — ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

نقوشِ خاطر 71

ڈاکٹر اسرار احمدؒ — مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی

انوارِ ہدایت 77

صبر کے مفہوم کی وسعت اور اس کا صلہ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

سیرت و سوانح 82

شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلویؒ — عبدالرشید عراقی

سبق پھر پڑھ 85

اسلام کا سیاسی نظام — شجاع الدین شیخ

❁ ❁ ❁

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

وزیراعظم پاکستان کا جنرل اسمبلی میں خطاب

پاکستان کے وزیراعظم محترم میاں نواز شریف اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب فرما چکے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ جو غیر جانبدارانہ سیاسی سوچ رکھتے ہیں اور حکومت سے بھی کوئی ذاتی مفاد نہیں رکھتے وہ بھی تعریف و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے ہیں۔ ہمیں بھی اس سے تو اختلاف نہیں ہے کہ تقریر میں بھرپور انداز میں کشمیر کا ذکر ہوا‘ لیکن اگر ہم اس تقریر کے الفاظ پر جانے کی بجائے اس حکومتی رویے پر باریک بینی سے نگاہ ڈالیں جو بحیثیت مجموعی حکومت خصوصاً وزیراعظم پاکستان نے بھارت کے حوالہ سے اپنایا ہوا ہے تو پھر تصویر کا بالکل دوسرا رخ نظر آتا ہے۔ ہمیں گفتار اور کردار کا واضح فرق نظر آیا ہے۔ اسی لیے ہم اس گفتگو کے صرف اُس مختصر سے حصہ کا ذکر کریں گے جس میں اُنہوں نے فرمایا کہ ’’افغانستان میں فوجی آپریشن ۱۵ سال سے ناکام ہے۔ آج بین الاقوامی برادری اتفاق کرتی ہے کہ اس ملک میں پائیدار امن کا واحد راستہ کابل میں حکومت اور افغان طالبان میں بات چیت میں ہے‘‘۔ اگر وہ کابل حکومت کی بجائے امریکہ کا نام لے لیتے جسے حقیقت میں افغانستان میں عبرت ناک فوجی شکست ہوئی ہے تو اُن کی بات زیادہ حقیقت پسندانہ اور جرأت مندانہ ہوتی۔ بہرحال جو کچھ اُنہوں نے کہا ہمارے نزدیک یہ بھی غیر متوقع تھا۔ جہاں تک تقریر میں کشمیر کا ذکر ہے اور بھرپور ذکر ہے‘ اِسے تاریخی پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے کہ زبان کو دل و دماغ کی کس قدر تائید حاصل تھی۔

یہ وقت کا تقاضا تھا‘ یہ حالات کا جبر تھا۔ یہ زبان سے اُس وِژن کا اظہار ہرگز نہ تھا جس کی بنیاد پر قائداعظم نے کہا تھا کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔ اگر کشمیر کا مسئلہ حقیقت میں اٹھانا مقصود ہوتا‘ اگر یہ حالات کے جبر اور وقت کے تقاضے کے ساتھ ساتھ اسٹیبلشمنٹ

کے دھکے کا نتیجہ نہ ہوتا‘ بلکہ ذہنی اور دلی طور پر اس مہم کو لے کر چلنے کی نیت یا خواہش ہوتی تو اڑھائی ماہ پہلے جب کشمیر میں عوامی تحریک برپا ہوئی تھی‘ پاکستان کا فارن آفس بھی ہوم ورک شروع کر دیتا۔ وزیراعظم نے امریکہ جانے سے کچھ روز پہلے پارلیمانی وفد کشمیر کا مسئلہ اجاگر کرنے کے لیے دنیا کے دورے پر بھیجنے کا فیصلہ کیا ہے‘ وہ ڈیڑھ دو ماہ پہلے یہ وفد تشکیل دیتے۔ پھر یہ کہ وفد کے ارکان کا چناؤ صاف ظاہر کرتا ہے کہ کچھ لوگوں کو سرکاری مال پر سیر سپاٹا کرانا مقصود ہے۔ حکومت کی اس غیر سنجیدگی اور نیم دلی سے مسئلہ اٹھانے کا اندازہ کیجیے کہ وفد کے ایک رکن کو یہ تک معلوم نہیں تھا کہ مقبوضہ کشمیر کی وزیراعلیٰ محترمہ محبوبہ مفتی ہیں۔ ملک بھر سے ۱۵ یا ۲۰ افراد کا ایک ایسا وفد جس کے ارکان کشمیر کی موجودہ صورت حال اور اس کے تاریخی پس منظر سے بخوبی آگاہ ہوتے جنرل اسمبلی کے اجلاس سے ایک ماہ پہلے دنیا کا طوفانی دورہ کرتے‘ زخمی کشمیریوں کی تصویریں ساتھ لے کر جاتے‘ گیارہ سالہ ناصر شفیع کی چھروں سے چھلنی لاش کو دنیا بھر میں پھیلاتے۔ تمام سفارت کاروں کی ذمہ داری لگائی جاتی کہ وہ اپنی باقی تمام مصروفیات ترک کر کے کشمیر کی صورت حال کی وضاحت کو ترجیح دیں۔ وزیراعظم نے ایک بند کمرے میں جنرل سکریٹری اقوام متحدہ کو بھارتی فوج کے ظلم اور تشدد کی چند تصاویر دکھائی ہیں۔ جنگل میں مورناچا کس نے دیکھا! اگر یہ کام مذکورہ بالا وفد یا ہمارے سفارت کاروں نے کیا ہوتا تو پھر وزیراعظم کی تقریر کچھ نہ کچھ اثر ضرور دکھاتی۔

یاد رکھیے دنیا میں کوئی بڑا اور مشکل کام مکمل ذہنی وابستگی اور دلی آمادگی کے بغیر سرانجام نہیں دیا جا سکتا۔ اور اگر قائداعظم نے سچ کہا تھا کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے تو پھر وطن کا درد رکھنے والے ہر شہری خصوصاً حکمران کو جنونی انداز میں کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ملک کے وزیراعظم کے لیے یہ ایسا مسئلہ ہوتا جسے حل کرنے کے لیے وہ شب و روز تگ و دو کر رہے ہوتے۔ ہم نے جو یہ عرض کیا ہے کہ وقت کے تقاضے‘ حالات کے جبر اور اسٹیبلشمنٹ کے دھکے نے وزیراعظم کو ایسی تقریر کرنے پر مجبور کیا وہ بلا دلیل اور غیر حقیقی نہیں ہے۔ موجودہ دورِ حکومت میں وزیراعظم نواز شریف کی کشمیر کے حوالے سے کارکردگی بلکہ طرزِ عمل ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

۲۰۱۳ء میں جنرل اسمبلی میں خطاب کے لیے نیویارک جاتے ہیں‘ کشمیر کا نام بھی

نہیں لیتے‘ جس پر ملک کے سنجیدہ حلقوں کو اعتراض ہوا‘ اسٹیبلشمنٹ نے بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا‘ لیکن میاں صاحب نے رتی بھر اثر قبول نہ کیا‘ بلکہ کشمیریوں کی جان و مال اور عزت کے دشمن بھارت کے لیے اُن کے منہ سے پھول جھڑتے رہے۔ اس سے پہلے بھارت کے وزیراعظم من موہن سنگھ کو اپنی حلف برداری کی تقریب میں شرکت کی دعوت دے چکے تھے‘ جو اُنہوں نے رد کر دی تھی‘ لیکن اس کے باوجود گجرات میں ہزاروں مسلمانوں کے قاتل مودی کی رسم تاج پوشی میں شرکت کے لیے بھاگم بھاگ دہلی پہنچے اور پاکستان کی تاریخ میں یہ واقعہ پہلی دفعہ ہوا کہ مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے حریت کے وفد کو کہہ دیا گیا کہ پاکستان کے وزیراعظم آپ سے نہیں مل سکتے۔ البتہ وزیراعظم پاکستان نے بھارتی اداکاروں اور ایکٹرسوں سے ملاقات کا وقت نکال لیا۔ پھر یہ کہ پروٹوکول کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے بیٹے حسین نواز کو ساتھ لے کر بھارت کے آئرن کنگ سے ملاقات کے لیے اُن کے گھر پہنچ گئے۔ ان صاحب کا افغانستان میں بھی لوہے کا کاروبار ہے۔ دروغ برگردنِ راوی‘ شنید یہ ہے کہ شریف فیملی اُن کے کاروبار میں پارٹنر بن چکی ہے۔ واللہ اعلم!

۲۰۱۳ء ہی کے رمضان المبارک میں پاکستان کے بھارت میں ہائی کمشنر نے حریت کے رہنماؤں کو دہلی میں افطار پارٹی کی دعوت دے رکھی تھی‘ لیکن چند روز پہلے کسی بھارتی وزیر کا پاکستان کے دورے کا امکان پیدا ہوا‘ فوری طور پر افطار پارٹی منسوخ کر دی گئی‘ کہ کہیں یہ افطار پارٹی بھارتی وزیر کے ممکنہ دورہ میں حائل نہ ہو جائے۔ چند ایک حریت رہنما دہلی پہنچ چکے تھے۔ اُنہیں بتایا گیا کہ افطار پارٹی منسوخ کر دی گئی ہے۔ کیا ایسی حکومت اور اُس کا سربراہ دل و جان سے کشمیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کر سکتا ہے؟

۲۰۱۴ء میں دھرنے نے کشمیر کا جنرل اسمبلی ذکر کرنے پر مجبور کیا اور آج مقبوضہ کشمیر میں چلنے والی عوامی تحریک اور پاکستانیوں کے اس حوالہ سے جوش وخروش کی مجبوری ہے کہ جنرل اسمبلی میں اس نوع کی تقریر کی گئی ہے۔ بہرحال بھارت سے ذاتی اور تجارتی تعلقات نبھانے کے لیے اور اپنی فوج کو ٹھینگا دکھانے کی خواہش کی تکمیل کے لیے ایسی ہی لیپا پوتی ہوتی رہے گی۔ اگر حکومت پاکستان اور اُس کے سربراہ کو حقیقت میں بھارت کو زچ کرنا اور

اُس کی پاکستان دشمنی کو بے نقاب کرنا ہوتا تو جنرل اسمبلی میں کھل کر بلوچستان میں بھارتی مداخلت کاروں کی تخریب کاری اور دہشت گردی کا ذکر کیا جاتا۔ بنگلہ دیش میں مودی کی تقریر کا حوالہ دیا جاتا جس میں کھلم کھلا اعترافِ جرم کیا گیا تھا۔ کل بھوشن یادیو کی بلوچستان سے گرفتاری کا ذکر کیا جاتا۔ یاد رہے کہ پہلی جنگ عظیم سے لے کر یعنی بیسویں صدی کے آغاز سے لے کر آج اکیسویں صدی تک یہ جدید دنیا کی تاریخ کا انوکھا ترین واقعہ ہے کہ کسی ملک کی خفیہ ایجنسی کا حاضر سروس آفیسر دشمن ملک میں جاسوسی کرتا ہوا پکڑا جائے۔ آج تک وزیراعظم پاکستان نے اس ''محترم'' جاسوس کا ذکر تک نہیں کیا‘ بھارت سے کوئی گلہ شکوہ یا شکایت تک نہیں کی گئی‘ اُسے شرم دلانا تو بہت دور کی بات ہے۔ جبکہ کچھ عرصہ پہلے بلوچستان میں دہشت گردی کے کئی واقعات ہوئے اور ان میں قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ اگر کل کلاں بلوچستان کی صورت حال بہت دگرگوں ہوتی ہے تب بلوچستان کے حوالے سے رونا پیٹنا کوئی فائدہ نہیں دے گا۔

آج ضرورت ہے کہ وہاں اچھی سیاسی قیادت لائی جائے جو امن وامان کے قیام کے لیے صحیح رخ پر جدوجہد کرے۔ جو گمراہ لوگ راہ راست پر آنے کو تیار ہوں اُن سے مذاکرات کیے جائیں اور جو بھارت کے کھلاڑی بن چکے ہیں اُن سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے اور ہر قسم کی بیرونی مداخلت کو ناممکن بنایا جائے۔

آخر میں ہم اپنے اس عزم کا اعادہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے جو ہمارے ایمان کا حصہ بن چکا ہے کہ اگر کشمیری یہ نعرہ لگاتے ہیں ''پاکستان سے رشتہ کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!'' تو پاکستان جب تک ''لا الٰہ الا اللہ'' کا عملی نمونہ نہیں بنتا یہ جوڑ کیسے لگے گا؟ البتہ یہ ہم پورے یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پاکستان میں مکمل طور پر نافذ ہو جائے تو بھارت کسی صورت کشمیر کو پاکستان کا حصہ بننے سے روک نہیں سکتا‘ بلکہ کشمیر پکے ہوئے پھل کی طرح پاکستان کی جھولی میں آ گرے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایسی صورت میں پاکستان کے داخلی مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور پاکستان کی شہ رگ بھی بھارتی قبضہ سے آزاد ہو جائے گی۔ ان شاءاللہ!

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُوْرَةُ الشُّعَرَاء

آیات ۱۷۶ تا ۱۹۱

كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧٦﴾ اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٧٧﴾ اِنِّىْ
لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٧٨﴾ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٧٩﴾ وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ
اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٨٠﴾ اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ
الْمُخْسِرِيْنَ ﴿١٨١﴾ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿١٨٢﴾ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ
وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿١٨٣﴾ وَاتَّقُوا الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ
الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٨٤﴾ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿١٨٥﴾ وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ
نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿١٨٦﴾ فَاَسْقِطْ عَلَيْنَا كِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنْ كُنْتَ مِنَ
الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٨٧﴾ قَالَ رَبِّىْٓ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿١٨٨﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمْ عَذَابُ
يَوْمِ الظُّلَّةِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿١٨٩﴾ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً ۭ وَمَا كَانَ
اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٩٠﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ﴿١٩١﴾

آیت ۱۷۶ ﴿كَذَّبَ اَصْحٰبُ لْئَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٧٦﴾﴾ ”(اور اسی طرح) اصحاب الایکہ نے بھی جھٹلایا رسولوں کو۔“

”ایکہ“ کے معنی جنگل یا بَن کے ہیں۔ یہ لفظ اس سے پہلے حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے لیے سورۃ الحجر کی آیت ۷۸ میں بھی آچکا ہے۔

آیت ۱۷۷ ﴿اِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿١٧٧﴾﴾ ”جب کہا اُن سے شعیبؑ نے کہ کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟“

آیت ۱۷۸ ﴿اِنِّىْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ﴿١٧٨﴾﴾ ”میں یقیناً تمہارے لیے ایک امانت دار رسولؑ ہوں۔“

آیت ۱۷۹ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿١٧٩﴾﴾ ”پس تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔“

آیت ۱۸۰ ﴿وَمَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِىَ اِلَّا عَلٰى رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٨٠﴾﴾ ”اور میں تم سے اس پر کسی اجرت کا طالب نہیں ہوں‘ نہیں ہے میری اجرت مگر تمام جہانوں کے رب کے ذمے۔“

آیت ۱۸۱ ﴿اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ﴿١٨١﴾﴾ ”پیمانوں کو پورا بھرا کرو اور خسارہ پہنچانے والوں میں سے مت ہو جاؤ۔“

آیت ۱۸۲ ﴿وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ﴿١٨٢﴾﴾ ”اور وزن کیا کرو سیدھی ترازو کے ساتھ۔“

آیت ۱۸۳ ﴿وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿١٨٣﴾﴾ ”اور مت گھٹا کر دیا کرو لوگوں کو ان کی چیزیں اور مت پھرو زمین میں فساد مچاتے ہوئے۔“

آیت ۱۸۴ ﴿وَاتَّقُوا الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٨٤﴾﴾ ”اور ڈرو اُس سے جس نے تمہیں پیدا کیا اور پہلی مخلوق کو بھی۔“

آیت ۱۸۵ ﴿قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ﴿١٨٥﴾﴾ ”انہوں نے کہا کہ تم تو بس سحر زدہ لوگوں میں سے ہو۔“

ہم تمہارے بارے میں یہی گمان کرتے ہیں کہ تم محض ایک سحر زدہ شخص ہو۔ تم پر کسی نے جادو کر دیا ہے جس کے زیر اثر ہمیں نصیحتیں کرتے رہتے ہو۔

آیت ۱۸۶ ﴿وَمَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَاِنْ نَّظُنُّكَ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿١٨٦﴾﴾ ”اور تم نہیں ہو مگر ہمارے ہی جیسے ایک انسان‘ اور تمہارے بارے میں ہمارا گمانِ غالب ہے کہ تم جھوٹوں میں سے ہو۔“

آیت ۱۸۷ ﴿فَاَسۡقِطۡ عَلَیۡنَا کِسَفًا مِّنَ السَّمَآءِ اِنۡ کُنۡتَ مِنَ الصّٰدِقِیۡنَ ﴿۱۸۷﴾﴾ ’’تو گرا دو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا اگر تم سچے ہو۔‘‘

آیت ۱۸۸ ﴿قَالَ رَبِّیۡۤ اَعۡلَمُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۸۸﴾﴾ ’’اُسؑ نے جواب دیا کہ میرا رب خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔‘‘

میری دعوت پر تمہارے ایک ایک ردِّعمل سمیت تمہارے طرزِ عمل اور تمہارے تمام کرتوتوں سے میرا پروردگار خوب واقف ہے۔

آیت ۱۸۹ ﴿فَکَذَّبُوۡہُ فَاَخَذَہُمۡ عَذَابُ یَوۡمِ الظُّلَّۃِ ؕ﴾ ’’تو انہوں نے اُس کو جھٹلا دیا‘ تو انہیں آ پکڑا سائبان والے دن کے عذاب نے۔‘‘

یوں لگتا ہے جیسے اس قوم پر پہلے اوپر سے کوئی عذاب آیا تھا اور ان پر سائبان کی طرح چھا گیا تھا۔

﴿اِنَّہٗ کَانَ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۸۹﴾﴾ ’’یقیناً وہ ایک بڑے دن کا عذاب تھا۔‘‘

آیت ۱۹۰ ﴿اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً ؕ وَ مَا کَانَ اَکۡثَرُہُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۹۰﴾﴾ ’’یقیناً اس میں ایک بڑی نشانی ہے‘ لیکن ان کی اکثریت ایمان لانے والی نہیں ہے۔‘‘

آیت ۱۹۱ ﴿وَ اِنَّ رَبَّکَ لَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ ﴿۱۹۱﴾﴾ ’’اور (اے نبیﷺ!) آپ کا رب بہت زبردست‘ نہایت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا ہے کہ مشرکین مکہ کو ابھی مزید مہلت دی جائے۔ اسی لیے حسی معجزے کے بارے میں ان کا مطالبہ ابھی پورا نہیں کیا جا رہا۔

یہاں انباء الرسلؑ کا بیان ختم ہوا۔ اس کے بعد اب ایک طویل رکوع آ رہا ہے جس میں رسول اللہﷺ سے خطاب ہے۔

آیات ۱۹۲ تا ۲۲۷

وَ اِنَّہٗ لَتَنۡزِیۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۹۲﴾ؕ نَزَلَ بِہِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ ﴿۱۹۳﴾ۙ عَلٰی قَلۡبِکَ لِتَکُوۡنَ
مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیۡنٍ ﴿۱۹۵﴾ؕ وَ اِنَّہٗ لَفِیۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۹۶﴾ اَوَ لَمۡ یَکُنۡ
لَّہُمۡ اٰیَۃً اَنۡ یَّعۡلَمَہٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ﴿۱۹۷﴾ؕ وَ لَوۡ نَزَّلۡنٰہُ عَلٰی بَعۡضِ

الۡاَعۡجَمِیۡنَ ﴿۱۹۸﴾ۙ فَقَرَاَہٗ عَلَیۡہِمۡ مَّا کَانُوۡا بِہٖ مُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۱۹۹﴾ؕ کَذٰلِکَ سَلَکۡنٰہُ فِیۡ
قُلُوۡبِ الۡمُجۡرِمِیۡنَ ﴿۲۰۰﴾ؕ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِہٖ حَتّٰی یَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِیۡمَ ﴿۲۰۱﴾ۙ فَیَاۡتِیَہُمۡ
بَغۡتَۃً وَّ ہُمۡ لَا یَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۰۲﴾ۙ فَیَقُوۡلُوۡا ہَلۡ نَحۡنُ مُنۡظَرُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾ؕ اَفَبِعَذَابِنَا
یَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۲۰۴﴾ اَفَرَءَیۡتَ اِنۡ مَّتَّعۡنٰہُمۡ سِنِیۡنَ ﴿۲۰۵﴾ۙ ثُمَّ جَآءَہُمۡ مَّا کَانُوۡا
یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۲۰۶﴾ۙ مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یُمَتَّعُوۡنَ ﴿۲۰۷﴾ؕ وَ مَاۤ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا
لَہَا مُنۡذِرُوۡنَ ﴿۲۰۸﴾ۖۛ ذِکۡرٰی ۟ۛ وَ مَا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۲۰۹﴾ وَ مَا تَنَزَّلَتۡ بِہِ الشَّیٰطِیۡنُ ﴿۲۱۰﴾
وَ مَا یَنۡۢبَغِیۡ لَہُمۡ وَ مَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ﴿۲۱۱﴾ؕ اِنَّہُمۡ عَنِ السَّمۡعِ لَمَعۡزُوۡلُوۡنَ ﴿۲۱۲﴾ؕ فَلَا تَدۡعُ
مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۲۱۳﴾ۚ وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴿۲۱۴﴾ۙ
وَ اخۡفِضۡ جَنَاحَکَ لِمَنِ اتَّبَعَکَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۲۱۵﴾ۚ فَاِنۡ عَصَوۡکَ فَقُلۡ اِنِّیۡ
بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾ۚ وَ تَوَکَّلۡ عَلَی الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ ﴿۲۱۷﴾ۙ الَّذِیۡ یَرٰىکَ حِیۡنَ
تَقُوۡمُ ﴿۲۱۸﴾ۙ وَ تَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِیۡنَ ﴿۲۱۹﴾ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ ﴿۲۲۰﴾ ہَلۡ اُنَبِّئُکُمۡ عَلٰی
مَنۡ تَنَزَّلُ الشَّیٰطِیۡنُ ﴿۲۲۱﴾ؕ تَنَزَّلُ عَلٰی کُلِّ اَفَّاکٍ اَثِیۡمٍ ﴿۲۲۲﴾ۙ یُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ
وَ اَکۡثَرُہُمۡ کٰذِبُوۡنَ ﴿۲۲۳﴾ؕ وَ الشُّعَرَآءُ یَتَّبِعُہُمُ الۡغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ؕ اَلَمۡ تَرَ اَنَّہُمۡ فِیۡ کُلِّ وَادٍ
یَّہِیۡمُوۡنَ ﴿۲۲۵﴾ۙ وَ اَنَّہُمۡ یَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا یَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲۲۶﴾ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ وَ ذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا وَّ انۡتَصَرُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا ؕ وَ سَیَعۡلَمُ
الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۲۲۷﴾

آیت ۱۹۲ ﴿وَ اِنَّہٗ لَتَنۡزِیۡلُ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۹۲﴾﴾ ’’اور یقیناً یہ (قرآن) تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل کردہ ہے۔‘‘

آیت ۱۹۳ ﴿نَزَلَ بِہِ الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ ﴿۱۹۳﴾﴾ ’’اُترے ہیں اسے لے کر روح الامینؑ۔‘‘

’’الرُّوۡحُ الۡاَمِیۡنُ‘‘ (امانت دار روح) سے مراد جبریلِ امین علیہ السلام ہیں۔

آیت ۱۹۴ ﴿عَلٰی قَلۡبِکَ لِتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُنۡذِرِیۡنَ ﴿۱۹۴﴾﴾ ’’آپ کے دل پر تاکہ آپ ہو جائیں خبردار کرنے والوں میں سے۔‘‘

میں نے قبل ازیں بھی بارہا یہ ذکر کیا ہے کہ حضورﷺ کی ذات میں اصل مہبطِ وحی آپ کا قلبِ مبارک تھا اور قلبِ مبارک کے اندر آپﷺ کی روح وحی کو قبول (receive) کرتی

تھی۔ انسانی علم کے حوالے سے یہ بات بھی گزشتہ سطور میں کئی دفعہ دہرائی جا چکی ہے کہ بنیادی طور پر انسانی علم کی دو اقسام ہیں۔ ایک علم تو وہ ہے جو انسان کو اس کے حواسِ خمسہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ یہ اکتسابی علم (Acquired knowledge) ہے جس کے لیے ہر انسان کوشش اور محنت کرتا ہے۔ اس علم کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ انسان حواسِ خمسہ سے معلومات حاصل کر کے انہیں process کرنے کے لیے دماغ یا عقل (قرآن میں انسان کی اس صلاحیت کے لیے ''فواد'' کا لفظ استعمال ہوا ہے) کے حوالے کرتا ہے۔ شخصی اور اجتماعی سطح پر یہ علم مسلسل ارتقاء پذیر ہے۔ دوسرا علم وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہِ راست انسانی قلب یا روح پر نازل ہوتا ہے۔ اس Revealed knowledge کی سب سے محفوظ اور مصدقہ صورت وحی کی ہے جو فرشتے کے ذریعے صرف انبیاء کرام ؑ پر نازل ہوتی تھی اور اسے شیاطین کی دخل اندازی سے مکمل طور پر محفوظ رکھا جاتا تھا۔ البتہ وحی کا دروازہ محمدٌ رسول اللہ ﷺ کے بعد ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے۔ اس قسم کے براہ راست علم (وہبی علم) کی جو صورتیں عام انسانوں کے لیے ممکن ہو سکتی ہیں ان میں الہام' القاء' کشف' رؤیائے صادقہ (سچے خواب) وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن ان میں سے کسی ذریعے سے حاصل ہونے والا علم دین اور شریعت میں حجت نہیں بن سکتا۔ دین اور شریعت میں حجت صرف قرآن اور سنت ہی ہیں۔ البتہ کسی کے ذاتی کشف کے ذریعے حاصل ہونے والی معلومات یا ہدایات اگر شریعت کے خلاف نہ ہوں تو خود اُس شخص کے لیے حجت بن سکتی ہیں' کسی دوسرے کے لیے نہیں۔

آیت ۱۹۵ ﴿بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيۡنٍ ﴿۱۹۵﴾﴾ ''(یہ نازل ہوا ہے) واضح عربی زبان میں۔''

آیت ۱۹۶ ﴿وَ اِنَّهٗ لَفِيۡ زُبُرِ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴿۱۹۶﴾﴾ ''اور یقیناً یہ پہلوں کے صحیفوں میں بھی موجود ہے۔''

اس کا یہ مطلب بھی ہے کہ اس کا ذکر اور اس کے بارے میں پیشین گوئیاں سابقہ آسمانی کتب میں پائی جاتی ہیں اور یہ بھی کہ اس کے بنیادی مضامین پہلی کتب اور صحیفوں میں بھی موجود ہیں۔ ان صحیفوں اور تورات و انجیل کی بنیادی تعلیمات وہی تھیں جو قرآن کی تعلیمات ہیں۔ اگر کوئی فرق یا اختلاف تھا تو صرف مختلف شریعتوں کے جزئیاتی احکام میں تھا۔ اس لحاظ سے قرآن ان تمام صحائف و کتب کا مُتَمِّم یعنی تکمیلی ایڈیشن ہے۔

آیت ۱۹۷ ﴿اَوَ لَمۡ يَكُنۡ لَّهُمۡ اٰيَةً اَنۡ يَّعۡلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ﴿۱۹۷﴾﴾ ''کیا ان

کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو جانتے ہیں علمائے بنی اسرائیل۔''

علمائے بنی اسرائیل بخوبی جانتے تھے کہ قرآن اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت اللہ کی طرف سے ہے۔

آیت ۱۹۸ ﴿وَ لَوۡ نَزَّلۡنٰهُ عَلٰى بَعۡضِ الۡاَعۡجَمِيۡنَ ﴿۱۹۸﴾﴾ ''اور اگر ہم نے اس (قرآن) کو نازل کر دیا ہوتا کسی عجمی پر۔''

آیت ۱۹۹ ﴿فَقَرَاَهٗ عَلَيۡهِمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ مُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۱۹۹﴾﴾ ''اور وہ اسے ان کو پڑھ کر سناتا تب بھی وہ اس پر ایمان لانے والے نہیں تھے۔''

ہم یہ بھی کر سکتے تھے کہ قرآن کسی ایسے شخص پر نازل کر دیتے جس کی مادری زبان عربی نہ ہوتی' پھر اگر ایسا شخص انہیں عربی قرآن پڑھ کر سناتا تو یہ گویا ایک کھلا معجزہ ہوتا' لیکن یہ لوگ پھر بھی اسے ماننے والے نہیں تھے۔

آیت ۲۰۰ ﴿كَذٰلِكَ سَلَكۡنٰهُ فِيۡ قُلُوۡبِ الۡمُجۡرِمِيۡنَ ﴿۲۰۰﴾﴾ ''اسی طرح ہم نے داخل کر دیا ہے اس (انکار) کو مجرموں کے دلوں میں۔''

قرآن کا انکار ان لوگوں کے دلوں میں اب ڈیرے جما چکا ہے۔ اب انہیں لاکھ معجزے دکھا دیے جائیں یہ ماننے والے نہیں ہیں۔

آیت ۲۰۱ ﴿لَا يُؤۡمِنُوۡنَ بِهٖ حَتّٰى يَرَوُا الۡعَذَابَ الۡاَلِيۡمَ ﴿۲۰۱﴾﴾ ''یہ ایمان نہیں لائیں گے اس پر جب تک کہ دیکھ نہ لیں دردناک عذاب کو۔''

آیت ۲۰۲ ﴿فَيَاۡتِيَهُمۡ بَغۡتَةً وَّهُمۡ لَا يَشۡعُرُوۡنَ ﴿۲۰۲﴾﴾ ''تو وہ ان پر اچانک آ جائے گا اور انہیں گمان بھی نہیں ہو گا۔''

آیت ۲۰۳ ﴿فَيَقُوۡلُوۡا هَلۡ نَحۡنُ مُنۡظَرُوۡنَ ﴿۲۰۳﴾﴾ ''(اُس وقت) یہ کہیں گے کہ کیا ہمیں مہلت مل سکتی ہے؟''

اُس وقت یہ دہائی دیں گے کہ کسی طریقے سے وہ عذاب ٹل جائے اور انہیں تھوڑی سی مہلت دے دی جائے۔

آیت ۲۰۴ ﴿اَفَبِعَذَابِنَا يَسۡتَعۡجِلُوۡنَ ﴿۲۰۴﴾﴾ ''تو کیا یہ لوگ ہمارے عذاب کے لیے جلدی مچا رہے ہیں؟''

اِس وقت تو یہ لوگ آپؐ سے بار بار مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ لے آئیں ہم پر وہ عذاب جس سے ہمیں آپؐ ڈراتے ہیں۔ ہم تو آپ کی روز روز کی تنبیہات سے تنگ آ گئے ہیں۔

آیت ۲۰۵ ﴿اَفَرَءَیۡتَ اِنۡ مَّتَّعۡنٰہُمۡ سِنِیۡنَ ﴿۲۰۵﴾﴾ ''تو کیا آپؐ نے دیکھا' اگر ہم انہیں چند سال اور بھی فائدہ اٹھانے دیں!''

آیت ۲۰۶ ﴿ثُمَّ جَآءَہُمۡ مَّا کَانُوۡا یُوۡعَدُوۡنَ ﴿۲۰۶﴾﴾ ''پھر ان پر وہ عذاب آ جائے جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے۔''

آیت ۲۰۷ ﴿مَاۤ اَغۡنٰی عَنۡہُمۡ مَّا کَانُوۡا یُمَتَّعُوۡنَ ﴿۲۰۷﴾﴾ ''تو کچھ کام نہیں آئے گا ان کے وہ سب کچھ جس سے وہ فائدہ پہنچائے جاتے تھے۔''

دنیا کا مال و متاع جس سے وہ فائدہ اٹھاتے رہے ہیں وہ انہیں اس عذاب سے بچا نہیں سکے گا۔

آیت ۲۰۸ ﴿وَ مَاۤ اَہۡلَکۡنَا مِنۡ قَرۡیَۃٍ اِلَّا لَہَا مُنۡذِرُوۡنَ ﴿۲۰۸﴾﴾ ''اور ہم نے کبھی کسی بستی کو ہلاک نہیں کیا مگر اس کے لیے خبردار کرنے والے تھے۔''

آیت ۲۰۹ ﴿ذِکۡرٰی ۟ۛ وَ مَا کُنَّا ظٰلِمِیۡنَ ﴿۲۰۹﴾﴾ ''یاد دہانی کے لیے' اور ہم ظالم نہیں ہیں۔''

گویا اس سلسلے میں یہ اللہ کا اٹل قانون ہے جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں اس طرح آیا ہے: ﴿وَ مَا کُنَّا مُعَذِّبِیۡنَ حَتّٰی نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا ﴿۱۵﴾﴾ ''اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں جب تک کہ رسولؑ نہ بھیج دیں''۔ یعنی کسی قوم پر اس وقت تک کبھی عذابِ استیصال نہیں آیا جب تک انہیں خبردار کرنے کے لیے کوئی رسولؑ مبعوث نہیں کر دیا گیا۔ لیکن رسولؑ کے اتمامِ حجت کرنے کے بعد بھی اگر متعلقہ قوم ایمان نہ لائی تو پھر ایسا عذاب آیا کہ صفحۂ ہستی سے اس کا نام و نشان مٹا دیا گیا: ﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الۡقَوۡمِ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡا ؕ﴾ (الانعام: ۴۵) ''پھر ظالم قوم کی جڑ کاٹ دی گئی۔''

آیت ۲۱۰ ﴿وَ مَا تَنَزَّلَتۡ بِہِ الشَّیٰطِیۡنُ ﴿۲۱۰﴾﴾ ''اور اس (قرآن) کو لے کر شیاطین نازل نہیں ہوئے۔''

عربوں کے ہاں عام لوگ شاعروں کے بارے میں یہ خیال رکھتے تھے کہ ان کے قابو میں

جن ہوتے ہیں جو ان کو نئی اور اچھی اچھی باتیں اشعار کی شکل میں جوڑ جوڑ کر دیتے رہتے ہیں۔ چنانچہ جب قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو بعض مشرکین نے اس کے بارے میں بھی کہنا شروع کر دیا کہ اسے شیاطین جن نازل کر رہے ہیں۔

آیت ۲۱۱ ﴿وَ مَا یَنۡۢبَغِیۡ لَہُمۡ وَ مَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ ﴿۲۱۱﴾﴾ ''اور نہ تو ایسا کرنا ان کے لائق ہے اور نہ ہی وہ اس کی استطاعت رکھتے ہیں۔''

آیت ۲۱۲ ﴿اِنَّہُمۡ عَنِ السَّمۡعِ لَمَعۡزُوۡلُوۡنَ ﴿۲۱۲﴾﴾ ''وہ تو (وحی الٰہی کے) سننے سے بھی معزول کیے جا چکے ہیں۔''

یہ بہت اہم مضمون ہے جو یہاں پہلی دفعہ آیا ہے' لیکن آئندہ سورتوں میں متعدد مقامات پر اس کا ذکر آئے گا۔ اس موضوع پر قرآن سے ہمیں جو معلومات ملتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ فرشتے نوری مخلوق ہیں اور جن آگ سے بنائے گئے ہیں: ﴿وَ خَلَقَ الۡجَآنَّ مِنۡ مَّارِجٍ مِّنۡ نَّارٍ ﴿۱۵﴾﴾ (الرحمٰن) ''اور پیدا کیا اس نے جنّات کو آگ کی لپٹ سے''۔ چونکہ فرشتوں کی طرح جنات کا مادۂ تخلیق بھی بہت لطیف ہے اس وجہ سے ان کے لیے فرشتوں کا قرب حاصل کر لینا اور ان سے کچھ معلومات حاصل کر لینا ممکن ہے۔ چنانچہ عام طور پر شیاطین جن کسی نہ کسی حد تک فرشتوں سے عالمِ بالا کی خبریں معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے' لیکن جب بھی کسی رسول کی بعثت ہوتی تو عالمِ بالا میں خصوصی پہرے بٹھا دیے جاتے تاکہ فرشتوں کے ذریعے وحی کی ترسیل کو محفوظ بنایا جا سکے۔ اسی اصول کے تحت محمدٌ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد عالم بالا کی خاص حدود سے آگے جنوں کا داخلہ مستقل طور پر بند کر دیا گیا اور وہاں سے وہ کسی قسم کی سُن گُن لینے کے اہل نہیں رہے۔ یہی وہ کیفیت اور صورتِ حال ہے جس کا ذکر آیت زیر مطالعہ میں کیا گیا ہے کہ وہ تو اب سننے سے بھی معزول کر دیے گئے ہیں اور عالم بالا سے ان کے سن گن لینے کا بھی کوئی امکان نہیں رہا۔ سورۃ الجن میں یہ مضمون قدرے زیادہ وضاحت سے آئے گا۔

آیت ۲۱۳ ﴿فَلَا تَدۡعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـہًا اٰخَرَ فَتَکُوۡنَ مِنَ الۡمُعَذَّبِیۡنَ ﴿۲۱۳﴾﴾ ''تو مت پکارنا اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو' ورنہ تم عذاب پانے والوں میں سے ہو کر رہو گے۔''

آیت ۲۱۴ ﴿وَ اَنۡذِرۡ عَشِیۡرَتَکَ الۡاَقۡرَبِیۡنَ ﴿۲۱۴﴾﴾ ''اور خبردار کیجیے اپنے قریبی رشتہ داروں کو۔''

اس آیت کے بارے میں تاریخ سے ثابت ہے کہ یہ تقریباً ۳ نبویؐ میں نازل ہوئی تھی۔ چنانچہ اس تاریخی ثبوت سے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے کہ سورۃ الشعراء بالکل ابتدائی زمانے کی سورت ہے۔ یہ سورت اپنی چھوٹی چھوٹی آیات اور تیز آہنگ کے ساتھ شروع سے آخر تک ایک مربوط اور مسلسل خطبے کی صورت میں ہے اور یہ آیت بھی اپنے انداز کے اعتبار سے ماقبل اور مابعد کی آیات سے مختلف نہیں۔ یعنی ایسا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ یہ آیت تو پہلے نازل ہوئی ہو مگر بعد میں نازل ہونے والی سورت میں شامل کر دی گئی ہو۔ بہرحال سورۃ الشعراء نازل تو ابتدائی دور میں ہوئی تھی مگر حکمتِ خداوندی کے تحت اسے ابتدائی زمانے کی سورتوں (قرآن کی آخری منزل) میں شامل کیے جانے کے بجائے اس کی موجودہ جگہ پر رکھا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سورۃ الحجر کو پچھلے گروپ کی سورتوں میں شامل کیا گیا ہے' حالانکہ وہ بھی بالکل ابتدائی زمانے میں نازل ہوئی تھی۔

روایات میں آتا ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی ؓ کو ایک دعوت کا اہتمام کرنے کے لیے فرمایا۔ حضرت علی ؓ آپ ﷺ ہی کے زیرکفالت تھے اور آپؐ کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے تمام بنو ہاشم کو کھانے پر مدعو کیا۔ کھانے کے بعد آپؐ انہیں دعوت دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو انہوں نے شور و غل مچانا شروع کر دیا اور آپؐ کی بات سنے بغیر چلے گئے۔ کچھ روز کے بعد آپ ﷺ نے دوبارہ انہیں مدعو فرمایا۔ اس دفعہ کھانے کے بعد چار و ناچار وہ بیٹھے رہے اور آپؐ نے ان کے سامنے ایک دعوتی خطبہ دیا۔ یہ خطبہ مختصر ہے مگر آپ ﷺ کے عظیم خطبات میں سے ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں احادیث کی کتب میں یہ خطبہ (اپنے علم کی حد تک مجھے وثوق ہے) موجود نہیں ہے' البتہ اہلِ تشیع کی مشہور کتاب ''نہج البلاغہ'' میں یہ خطبہ شامل ہے۔ ''نہج البلاغہ'' بنیادی طور پر حضرت علی ؓ کے خطبات اور خطوط پر مشتمل ہے' لیکن اس کا ایک حصہ حضور ﷺ کے خطبات کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ اگرچہ ''نہج البلاغہ'' میں خطبہ کے متن کے ساتھ کسی قسم کی صراحت موجود نہیں کہ یہ خطبہ کس موقع پر ارشاد فرمایا گیا مگر خطبے کے متن اور اسلوب کی بنا پر مجھے یقین ہے کہ یہ وہی خطبہ ہے جو آپ ﷺ نے بنو ہاشم کی مذکورہ ضیافت کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ میرے کتابچے ''دعوت الی اللہ'' اور اس کتابچے کے انگلش ترجمے "Calling People unto Allah" میں اس خطبے کا پورا متن موجود ہے۔ بہرحال

''دعوتِ حق'' کے حوالے سے یہ بہت اہم خطبہ ہے۔

آیت ۲۱۵ ﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۲۱۵﴾﴾ ''اور اپنے بازو جھکا کر رکھیں ان کے لیے جو آپؐ کے پیروکار ہیں مؤمنین میں سے۔''

حضور ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ آپؐ مؤمنین کے ساتھ تواضع سے پیش آئیں اور ہمیشہ ان کی دلجوئی فرمائیں۔ جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہو چکا ہے' سورۃ الشعراء اور سورۃ الحجر کا زمانۂ نزول ایک ہی ہے اور اسی لحاظ سے ان دونوں سورتوں میں گہری مشابہت بھی پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس آیت سے ملتے جلتے الفاظ سورۃ الحجر کے آخر میں بھی آئے ہیں: ﴿وَاخۡفِضۡ جَنَاحَكَ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ﴿۸۸﴾﴾ ''اور اہلِ ایمان کے لیے اپنے بازو جھکا کر رکھیں۔''

آیت ۲۱۶ ﴿فَاِنۡ عَصَوۡكَ فَقُلۡ اِنِّىۡ بَرِىۡٓءٌ مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۱۶﴾﴾ ''پھر اگر یہ لوگ آپؐ کی نافرمانی کریں تو ان سے کہہ دیجیے کہ میں بری ہوں اس سے جو کچھ تم کر رہے ہو۔''

سورۃ الکافرون میں بھی اسی طرح دوٹوک انداز میں حکم دیا گیا ہے: ﴿قُلۡ يٰۤاَيُّهَا الۡكٰفِرُوۡنَ ﴿۱﴾ لَاۤ اَعۡبُدُ مَا تَعۡبُدُوۡنَ ﴿۲﴾ وَلَاۤ اَنۡتُمۡ عٰبِدُوۡنَ مَاۤ اَعۡبُدُ ﴿۳﴾﴾ ''آپؐ کہہ دیجیے کہ اے کافرو! میں عبادت نہیں کرتا اُس کی جس کی تم لوگ عبادت کرتے ہو۔ اور نہ تم عبادت کرنے والے ہو اس کی جس کی میں عبادت کرتا ہوں''۔ اور پھر آخر میں بہت واضح طور پر اعلانِ براءت کر دیا گیا: ﴿لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِىَ دِيۡنِ ﴿۵﴾﴾ ''تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔''

آیت ۲۱۷ ﴿وَتَوَكَّلۡ عَلَى الۡعَزِيۡزِ الرَّحِيۡمِ ﴿۲۱۷﴾﴾ ''اور (اے نبی ﷺ!) آپ بھروسہ کیجیے اُس اللہ پر جو بہت زبردست' نہایت رحم کرنے والا ہے۔''

آیت ۲۱۸ ﴿الَّذِىۡ يَرٰٮكَ حِيۡنَ تَقُوۡمُ ﴿۲۱۸﴾﴾ ''جو دیکھتا ہے آپؐ کو جب آپؐ کھڑے ہوتے ہیں۔''

اس سے آپ ﷺ کا تہجد کے لیے کھڑے ہونا مراد ہے۔ واضح رہے کہ تہجد کا حکم آپ ﷺ کو بالکل ابتدائی دور میں ہی دے دیا گیا تھا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الۡمُزَّمِّلُ ﴿۱﴾ قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۲﴾﴾ (المزمل) ''اے چادر میں لپٹنے والے! قیام کیجیے رات میں مگر تھوڑا''۔ تو گویا یہاں اسی حوالے سے فرمایا جا رہا ہے کہ اے نبی ﷺ! جب آپ تہجد کے لیے ہمارے حضور کھڑے

ہوتے ہیں تو اس وقت ہم آپ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہم بے شک آپ کی نظروں سے پوشیدہ ہیں مگر آپ ہماری نظروں سے پوشیدہ نہیں ہیں: ﴿لَا تُدۡرِکُهُ الۡاَبۡصَارُ ۫ وَهُوَ يُدۡرِکُ الۡاَبۡصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ ﴿۱۰۳﴾﴾ (الانعام) ’’اُسے نگاہیں نہیں پاسکتیں جبکہ وہ تمہاری نگاہوں کو پا لیتا ہے‘ اور وہ لطیف بھی ہے اور ہر چیز سے باخبر بھی۔‘‘

آیت ۲۱۹ ﴿وَتَقَلُّبَکَ فِی السّٰجِدِيۡنَ ﴿۲۱۹﴾﴾ ’’اور (وہ دیکھتا ہے) آپؐ کے آنے جانے کو سجدہ کرنے والوں میں۔‘‘

حضور ﷺ کا معمول تھا کہ آپؐ تہجد کی نماز پڑھنے والے مسلمانوں کے گھروں کے پاس سے رات کو گزرتے اور ان کو دیکھتے تھے۔ آپ ﷺ کے اسی معمول کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے۔

آیت ۲۲۰ ﴿اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۲۲۰﴾﴾ ’’یقیناً وہ سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔‘‘

آیت ۲۲۱ ﴿هَلۡ اُنَبِّئُكُمۡ عَلٰی مَنۡ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيۡنُ ﴿۲۲۱﴾﴾ ’’کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کن پر اُترا کرتے ہیں؟‘‘

اے وہ لوگو! جو سمجھتے ہو کہ یہ قرآن جنات اور خبیث روحوں کا بنایا ہوا ہے‘ آؤ! میں تمہیں بتاؤں کہ یہ شیاطین جو ہیں وہ کن لوگوں پر اُترا کرتے ہیں۔

آیت ۲۲۲ ﴿تَنَزَّلُ عَلٰی كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ ﴿۲۲۲﴾﴾ ’’وہ تو اُترتے ہیں ہر جھوٹ گھڑنے والے گناہگار پر۔‘‘

یہ تو گویا ’’کند ہم جنس باہم جنس پرواز‘‘ والا معاملہ ہے۔ یعنی گندے اور خبیث کردار‘ دوستی اور قرب کے لیے اپنے جیسے کرداروں ہی کو ڈھونڈتے ہیں۔ چنانچہ شیاطین بھی اپنے التفات کے لیے انسانوں میں سے انہی لوگوں کے ساتھ رابطہ رکھیں گے جو گناہ اور بدکرداری میں اپنی مثال آپ ہوں۔

آیت ۲۲۳ ﴿يُّلۡقُوۡنَ السَّمۡعَ وَاَكۡثَرُهُمۡ كٰذِبُوۡنَ ﴿۲۲۳﴾﴾ ’’وہ القا کرتے ہیں سُنی سنائی باتیں‘ اور ان میں سے اکثر جھوٹے ہوتے ہیں۔‘‘

آیت ۲۲۴ ﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الۡغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾﴾ ’’اور شعراء کی پیروی تو گمراہ لوگ کرتے ہیں۔‘‘

مشرکینِ مکہ میں سے کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ محمد (ﷺ) نے شاعری سیکھ لی ہے اور یہ کہ قرآن دراصل ان کا شاعرانہ کلام ہے۔ اس حوالے سے یہاں دراصل یہ بتانا مقصود ہے کہ شاعروں کے کردار کو تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔ تم خود سوچو کہ ایسے کردار کو ہمارے رسول (ﷺ) کے کردار سے کیا نسبت؟

اس آیت میں شعراء کے پیروکاروں کے بارے میں جو بنیادی اصول بتایا گیا ہے اس میں مجھے کوئی استثناء (exception) نظر نہیں آتا۔ اگرچہ علامہ اقبال کا معاملہ بہت سے اعتبارات سے مختلف ہے مگر ان کے پیروکاروں پر بھی قرآن کا یہ قانون سو فیصد منطبق ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو اس پہلو سے دیکھنا چاہیے کہ علامہ اقبال کے حاشیہ نشینوں میں سے کوئی ایک شخص بھی ایسا سامنے نہیں آسکا جس نے ان کے نظریات کی روشنی سے اپنی عملی زندگی کا کوئی گوشہ روشن کیا ہو اور اپنی شخصیت میں بندۂ مؤمن کے اس کردار کی کوئی رمق پیدا کرنے کی کوشش کی ہو جس کا نقشہ علامہ اقبال نے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ بلکہ علامہ اقبال تو خود اپنے بارے میں بھی اعتراف کرتے ہیں کہ محض گفتار کے غازی تھے: ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا‘ کردار کا غازی بن نہ سکا!

اس حوالے سے سورۂ یٰسین کی آیت ۶۹ میں حضور ﷺ کے بارے میں بہت واضح طور پر فرما دیا گیا ہے: ﴿وَمَا عَلَّمۡنٰهُ الشِّعۡرَ وَمَا يَنۡۢبَغِیۡ لَهٗ ؕ﴾ ’’ہم نے آپؐ کو شعر کہنا سکھایا ہی نہیں اور یہ آپؐ کے شایانِ شان ہی نہیں۔‘‘

آیت ۲۲۵ ﴿اَلَمۡ تَرَ اَنَّهُمۡ فِیۡ كُلِّ وَادٍ يَّهِيۡمُوۡنَ ﴿۲۲۵﴾﴾ ’’کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ وہ ہر وادی میں سرگرداں رہتے ہیں۔‘‘

غزل کے ایک شعر میں شاعر لوگ مشرق کی بات کرتے ہیں تو دوسرے میں مغرب کی۔ ایک مصرعے میں اپنی آسمان کی سیر کا ذکر کرتے ہیں تو دوسرے میں زمین پر آ کر صحرا نوردی کرتے نظر آتے ہیں۔

آیت ۲۲۶ ﴿وَاَنَّهُمۡ يَقُوۡلُوۡنَ مَا لَا يَفۡعَلُوۡنَ ﴿۲۲۶﴾﴾ ’’اور یہ کہ وہ جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔‘‘

شعراء کے بارے میں سب سے بڑی بات یہاں یہ بتائی گئی کہ ان کے قول وفعل میں

تضاد ہوتا ہے اور یہ عادت بہت گھٹیا کردار کی مظہر ہے۔

آیت ۲۲۷ ﴿اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ ذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیۡرًا﴾ ’’سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں اور کثرت سے اللہ کا ذکر کریں‘‘

یہ البتہ استثنائی حکم ہے۔ کوئی شاعر اگر حقیقی مؤمن ہو اور اعمالِ صالحہ پر کاربند ہونے کے ساتھ ساتھ کثرتِ ذکر اللہ پر بھی مداومت کرے تو وہ یقیناً مذکورہ بالا مذمت سے مستثنیٰ ہو گا اور اس کا کلام بھی خیر اور بھلائی کا باعث بنے گا۔ اس سلسلے میں حضرت حسّان بن ثابت ؓ کی مثال دی جا سکتی ہے جو دربارِ نبویؐ کے شاعر تھے۔ عرب میں اس وقت شاعری کا بہت رواج تھا اور مشرکین کے شعراء ہجو یہ اشعار کے ذریعے حضور ﷺ کی شان میں گستاخی کرتے تھے۔ چنانچہ اس میدان میں ان کے جواب کی ضرورت محسوس ہوئی تو یہ فریضہ حضرت حسّان بن ثابت ؓ نے انجام دیا۔ اس لحاظ سے آپؓ سب سے پہلے نعت گو شاعر بھی ہیں۔ البتہ شعراء کے بارے میں قرآن کا یہ تبصرہ اس قدر جامع اور مبنی بر حقیقت ہے کہ استثنائی صورتوں میں بھی کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی کسر رہ ہی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت حسان بن ثابت ؓ کو اگرچہ دربارِ نبویؐ کا شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے اور بطور صحابی بھی ان کا درجہ بہت بلند ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ آپؓ مردِ میدان نہیں تھے۔ غزوۂ احزاب کے موقع پر حضور ﷺ نے ان کو اس مکان پر بطور پہرے دار متعین فرمایا تھا جہاں پر مسلمان خواتین کو رکھا گیا تھا۔ حضور ﷺ کی پھوپھی حضرت صفیہ ؓ نے ایک یہودی کو مشکوک انداز میں اس مکان کے آس پاس پھرتے دیکھا تو انہوں نے حضرت حسانؓ سے کہا کہ آپ جا کر اس شخص کو قتل کر دیں۔ یہ سن کر حضرت حسانؓ نے صاف معذرت کر دی کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ اس پر حضرت صفیہؓ ایک لکڑی ہاتھ میں لے کر گئیں اور اس لکڑی سے یہودی کے سر پر ایسی ضرب لگائی کہ اس کا کام تمام کر دیا۔ واپس آ کر انہوں نے حضرت حسانؓ سے کہا کہ اب آپ جا کر اس یہودی کے ہتھیار وغیرہ اتار کر لے آئیں۔ اس پر انہوںؓ نے جواب دیا کہ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔

﴿وَّ انۡتَصَرُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا ظُلِمُوۡا ؕ﴾ ’’اور وہ بدلہ لیں اس کے بعد کہ اُن پر ظلم کیا گیا ہو۔‘‘

یہ ان مستثنیٰ قسم کے شاعروں کی چوتھی صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ ضرورت پیش آنے پر ظالموں کے مقابلے میں حق کی حمایت کے لیے اپنی زبان سے وہی کام لیں جو ایک مجاہد تیر و

شمشیر سے لیتا ہے۔

جیسے حضرت حسان بن ثابت ؓ کفار کی طرف سے حضور ﷺ کے خلاف کہے گئے ہجو یہ اشعار کا جواب دیا کرتے تھے اور حضور ﷺ کی طرف سے مدافعت کرتے تھے۔ حضور ﷺ نے انؓ کے بارے میں فرمایا تھا کہ حسان کے اشعار کُفار کے خلاف مسلمانوں کے تیروں سے بھی زیادہ مؤثر ہیں۔ بہرحال ہر چیز کی اپنی جگہ پر اہمیت مسلّم ہے۔

﴿وَ سَیَعۡلَمُ الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اَیَّ مُنۡقَلَبٍ یَّنۡقَلِبُوۡنَ ﴿۲۲۷﴾﴾ ’’اور عنقریب یہ ظالم جان لیں گے کہ کس جگہ لوٹ کر جائیں گے!‘‘

ان کو عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔ یہ اسی طرح کا محاورہ ہے جیسے ہمارے ہاں اردو میں کہا جاتا ہے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ یعنی ابھی ان لوگوں کو نظر نہیں آ رہا، لیکن عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب قرآن کا بیان کردہ بھیانک انجام ان لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ہو گا۔

بارک اللّٰہ لی ولکم فی القرآن العظیم ونفعنی وایّاکم بالآیات والذّکر الحکیم oo

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت و فرضیت، بعنوان:
توحیدِ عملی
سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
اشاعت خاص 150 روپے، اشاعت عام 100 روپے

یقین: روحِ سعی و عمل

از ڈاکٹر اسرار احمد

یہ مقالہ ریڈیو پاکستان لاہور کے ماہِ ربیع الاول کے پروگرام

خیر الوریٰ ﷺ

میں بتاریخ ۱۴/ جنوری ۱۹۸۰ء نشر ہوا

احمدہ واُصلّی علٰی رسولہِ الکریم ۔ اَمّا بعد :

فاعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

محترم صدرِ مجلس ومہمانِ خصوصی اور معزز سامعین!

یہ بات کہ یقین ہی انسان کی سعی و عمل کی اصل روح ہے' اتنی ظاہر و باہر ہے کہ بظاہر اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا تحصیلِ حاصل نظر آتا ہے —— اس لیے کہ کون نہیں جانتا کہ انسانی شخصیت کے دو پہلو ہیں: ایک علمی یا فکری ونظری پہلو اور دوسرا عملی پہلو —— اور دونوں کے مابین ایک نہایت گہرا اور مضبوط تعلق پایا جاتا ہے۔ یعنی ایک سبب ہے اور دوسرا اس کا نتیجہ' اور ان کے مابین لازم وملزوم کی یہ نسبت اتنی قوی ہے کہ دونوں کو ایک ہی تصویر کے دو رخ قرار دینا قطعاً غلط نہ ہوگا۔ یعنی ایک انسانی شخصیت کا باطنی و داخلی رخ ہے اور دوسرا اس کا ظاہری و خارجی رُخ —— چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ جو باتیں انسان کے فکر ونظر میں رچتی بستی چلی جاتی ہیں' گویا جن امور پر یقین اس کے دل و دماغ میں راسخ ہوتا چلا جاتا ہے' اُن کے اثرات اس کے فعل وعمل' سعی و جہد اور طلب وجستجو میں نمایاں ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھر جتنا جتنا اضافہ اس یقین کی گہرائی و گیرائی میں ہوتا چلا جاتا ہے' اتنی ہی شدت سعی وعمل میں بڑھتی چلی جاتی ہے —— یہاں تک کہ کسی انسان کی سعی وعمل کے انداز اور طلب وجستجو کے رخ سے اُس

کے عقائد ونظریات بھی پوری صحت کے ساتھ مستنبط کیے جاسکتے ہیں اور اُن کے سطحی یا راسخ ہونے کا بھی ٹھیک ٹھیک اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

البتہ ایک وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ یہ معاملہ انسان کے حقیقی اور واقعی افکار و نظریات یا بالفاظِ دیگر اُس کی اصل ذہنی اقدار کا ہے' اس کے مبینہ عقائد یا مزعومہ خیالات و نظریات کا نہیں۔ اس لیے کہ قول وفعل کا وہ تضاد جو بہت سے انسانوں میں نظر آتا ہے' دراصل اس کے حقیقی و واقعی نظریات اور اس کے مبینہ عقائد کے فرق وتفاوت کا مظہر ہوتا ہے' قطع نظر اس سے کہ خود اسے اس کا ادراک وشعور ہو یا نہ ہو —— اسی طرح کا ایک معاملہ ان مریض شخصیتوں کا بھی ہے جنہیں ضعفِ ارادہ کی بیماری لاحق ہوتی ہے' جس کے باعث ان کے حقیقی عقائد ونظریات بھی ان کے عمل پر پوری طرح اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ ایک استثنائی معاملہ ہے' ورنہ عام اصول بہرحال یہی ہے کہ ایک نارمل انسان کی سعی وعمل کا رخ بھی اس کے یقین ہی سے متعین ہوتا ہے اور اس کی شدت وقوت یا ضعف واضمحلال کا دارومدار بھی یقین کی پختگی یا کمزوری ہی پر ہوتا ہے۔

اس میں ہرگز کوئی شک یا شبہ نہیں ہے کہ حضرت خیر الوریٰ صلی اللّٰہ علیہ وسلّم وفداہ آباءُنا واُمّھاتُنا' جن کے نام نامی اور اسم گرامی سے یہ سلسلۂ تقاریر معنون ہے' کی تعلیم و تلقین اور تزکیہ وتربیت سے جو پیکرِ یقین اور مجسمۂ سعی وعمل جماعت' رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین' تیار ہوئی تھی اس کی کوئی دوسری نظیر پوری انسانی تاریخ پیش کرنے سے عاجز ہے۔ البتہ جب آنحضور ﷺ کے حوالے سے بات کی جائے تو یقین کے ضمن میں ایک وسیع تر اصطلاح سامنے آتی ہے —— یعنی 'ایمان' اور سعی وعمل کے لیے ایک زیادہ حسین وجامع عنوان سامنے آتا ہے —— یعنی 'جہاد' اور ان دونوں کے مابین چولی دامن کے رشتے اور لازم وملزوم کی نسبت کو واضح کیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر مختلف الفاظ واسالیب ہیں۔ ان میں سے اہم ترین اور جامع ترین مقام تو ہے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵' جہاں ارشاد ہوتا ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ⑮﴾

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسولؐ پر پھر شک میں نہیں

پڑے اور جہاد کیا انہوں نے اپنے اموال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں۔

(حقیقت میں) صرف یہی لوگ سچے ہیں۔‘‘

یہی بات سورۃ الصّف میں ان الفاظ میں سامنے آتی ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰی تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝۱۰ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۱﴾

’’اے اہلِ ایمان! کیا میں تمہاری رہنمائی کروں اُس کاروبار کی جانب جو تمہیں دردناک عذاب سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان محکم رکھو اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور اپنی جانوں سے‘ اگر تم صاحبِ علم ہو تو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے!‘‘

اور بعؔ ’’اِک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں!‘‘ کے مصداق یہی حقیقت واضح کی گئی ہے سورۃ الانفال کی آیت ۷۴ میں بدیں الفاظ:

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْۤا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ ۝۷۴﴾

’’اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں‘ اور وہ جنہوں نے پناہ دی اور نصرت کی‘ یہی لوگ ہیں حقیقتاً مؤمن‘ ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور باعزت رزق بھی!‘‘

ذہن و قلب کی وہ خاص کیفیت جو قرآن حکیم کی آیات بینات اور نبی اکرم ﷺ کی تعلیم و تربیت کے ذریعے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نفوس میں پیدا ہو گئی تھی —— یا صحیح تر الفاظ میں جو قرآن حکیم کی آیاتِ بینات کے ذریعے نبی اکرم ﷺ نے پیدا فرما دی تھی: بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ﴾ (الحدید:۹) اس کی تعبیر کے لیے قرآن حکیم اگرچہ کہیں کہیں لفظ ’یقین‘ بھی استعمال کرتا ہے‘ بالخصوص آخرت کے ضمن میں —— لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے لیے قرآن کی اصل اصطلاح ’ایمان‘ ہی کی ہے جو ’یقین‘ کی نسبت وسیع تر بھی ہے اور زیادہ بامعنی بھی۔

’یقین‘ کے لفظی معنی کے ضمن میں امام راغب اصفہانی اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ’’مفردات

القرآن‘‘ میں لکھتے ہیں:

الیقینُ صِفَةُ العلم فوقَ المعرفةِ والدِّرایة واخواتها۔ یقال علم الیقین ولا یقال معرفة الیقین وهو سکونُ الفهم مَعَ ثَبَاتِ الْحُکْمِ

’’یقین اگرچہ علم ہی کی کیفیت کا نام ہے‘ تاہم وہ مجرد عقلی پہچان یا منطقی استدلال اور اس قبیل کی دوسری چیزوں سے بلند تر ہے۔ چنانچہ ’علم الیقین‘ تو کہا جاتا ہے لیکن معرفۃ الیقین نہیں بولا جاتا۔ گویا یقین وہ کیفیت ہے جس میں فہم و شعور کا ٹھہراؤ اور رائے کی پختگی دونوں شامل ہیں ——!!‘‘

اس سے ایک تو یہ واضح ہو گیا کہ ’یقین‘ ایک خالص داخلی کیفیت کا نام ہے اور دوسرے یہ اشارہ بھی مل گیا کہ اس میں کسی بات کے صحیح یا مطابق واقعہ ہونے یا نہ ہونے سے کوئی بحث نہیں ہے۔ گویا ’یقین‘ صحیح بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی —— ایمان کا معاملہ ان دونوں اعتبارات سے بالکل برعکس ہے۔ چنانچہ ایک جانب تو اس میں ’’تصدیقٌ بِالقَلب‘‘ کے ساتھ ساتھ ’اقرارٌ بِاللِّسان‘‘ بھی لازمی ہے اور دوسری جانب ایمان نام ہے نفس الامر کی ان ازلی و ابدی حقیقتوں پر یقین کا‘ جن کی شہادت خود فطرتِ انسانی میں مضمر ہے‘ لہٰذا اس کا اصل حاصل ہے ذہنی سکون اور قلبی اطمینان یا بالفاظِ دیگر شخصیتِ انسانی کا داخلی امن۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم کی یہ اساسی و بنیادی اصطلاح ماخوذ ہی ’امن‘ کے مادے سے ہے۔

’ایمان‘ —— ’امن‘ سے بابِ افعال کا مصدر ہے جس کے خواص میں ’تعدیہ‘ بھی شامل ہے۔ یعنی جو افعال ثلاثی مجرد میں ’لازم‘ ہوتے ہیں وہ اس باب میں آ کر بالعموم ’متعدی‘ ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس کے لفظی معنی ہوئے ’امن دینا‘ —— اور جب اس پر اضافہ ہو حروفِ جار ’با‘ یا ’لام‘ کا تو اس کے معنی ہو جاتے ہیں کسی کی تصدیق کرنا۔ ’لام‘ کے ساتھ ہو تو عموماً سطحی اور سرسری سی تصدیق مراد ہوتی ہے اور ’با‘ کے ساتھ ہو تو پورے وثوق اور اعتماد والی تصدیق —— واضح رہے کہ اصل مادے یعنی ’امن‘ سے اس کا تعلق اب بھی منقطع نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ کسی شخص کی لائی ہوئی کسی خبر یا اس کے کسی دعوے کی تردید و تکذیب کا لازمی نتیجہ ردّ و قدح اور فتنہ و فساد ہے اور اس کی توثیق و تصدیق کا منطقی نتیجہ امن و سکون۔ چنانچہ اصطلاحِ شرع میں ایمان نام ہے: تصدیقُ بما جاء به النبی ﷺ کا‘ یعنی ان امورِ غیبی کی تصدیق کا جن کی خبر دی ہے محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے —— اور بالکل فطری اور منطقی طور پر اس کے دو رخ یا دو پہلو ہیں: ایک خارجی و ظاہری یعنی ’’اِقرارٌ بِاللِّسان‘‘ والا پہلو جس پر اس دنیا میں کسی انسان کے مؤمن

وسلم قرار دیے جانے کا دارومدار ہے۔ چنانچہ وہ کلمہ شہادت کی صورت میں ارکانِ اسلام میں اوّلین رکن کی حیثیت سے شامل ہے' اور دوسرا داخلی و باطنی پہلو جو عبارت ہے 'یقینِ قلبی' سے اور جو رکنِ رکین ہے ایمانِ حقیقی کا اور جس کا لازمی نتیجہ ہے جہاد یا مجاہدہ فی سبیل اللہ —— !!

الغرض ایمانِ حقیقی ہی کا دوسرا نام یقین ہے اور اس کا محل 'قلب' ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ایمانِ حقیقی کا محل 'قلب' کو قرار دیا گیا' جیسے:

(۱) سورۃ الحجرات کی آیت ۷ میں صحابہ کرام ؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾

''اللہ نے محبوب بنا دیا ہے تمہارے نزدیک ایمان کو اور کھبا دیا ہے اسے تمہارے دلوں میں —— !!''

(۲) اور آیت ۱۴ میں بعض بدوؤں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾

''اور ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

(۳) اسی طرح سورۃ المجادلہ کی آیت ۲۲ میں سچے اور مخلص اہلِ ایمان کے بارے میں فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ؕ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾﴾

''یہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں راسخ کر دیا ہے ایمان اور تائید کی ہے ان کی اپنے خاص فیض سے' اور داخل کرے گا ان کو ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی اور وہ اس سے خوش۔ یہ جماعت ہے اللہ کی۔ سن رکھو اللہ کی جماعت ہی فلاح پانے والی ہے —— !!''

اس یقین قلبی کے تین مدارج قرآن حکیم نے متعین فرمائے ہیں۔ علم الیقین' عین الیقین اور حقّ الیقین۔ ان میں سے مقدم الذکر دونوں کا تذکرہ سورۃ التکاثر میں ہے اور مؤخر الذکر الفاظ دو جگہ آئے ہیں' ایک سورۃ الواقعہ میں اور دوسرے سورۃ الحاقّہ میں —— ان تینوں کے مابین فرق و تفاوت کو آگ کی سادہ سی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اگر کہیں دور سے دھواں نظر آئے تو یقین پیدا ہو جاتا ہے کہ وہاں آگ ہے۔ یہ علم الیقین کا پہلا درجہ ہے جس میں کسی شے

کے وجود کا یقین خود اس کے مشاہدے سے نہیں بلکہ اس کے آثار کے مشاہدے کی بنا پر ہوا ہے۔ گویا اس میں تعقّل و تفکّر اور استدلال اور استنباط و استنتاج کا واسطہ پایا جاتا ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ آپ خود آگے بڑھ کر اپنی آنکھ سے آگ کا مشاہدہ کر لیں' یہ عین الیقین ہے اور اس میں یقین کی شدت پہلے کی نسبت یقیناً بہت زیادہ ہے۔ تاہم ع ''آنچہ می بینم بیدار یست یا رب یا بخواب!'' کے مصداق ایک امکان باقی رہتا ہے کہ شاید وہ صرف صورتِ نار ہو فی الواقع نار نہ ہو۔ لیکن اگر اس آگ کی کوئی چنگاری اڑ کر آپ کی جلد پر پڑ جائے اور اس کی جلن اور سوزش آپ خود محسوس کر لیں تو اب یہ وسوسہ بھی ختم ہو جاتا ہے اور یقین اپنے تکمیلی درجے کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ ہے حق الیقین کا درجہ —— !!

چنانچہ یہی فرق و تفاوت ایمان کے مراتب و مدارج کے درمیان بھی پایا جاتا ہے۔ اور اس ایمان سے قطع نظر جس میں ساری بحث 'اِقرارٌ باللِّسان'' اور 'شہادت' سے ہے' تصدیق قلبی زیر بحث ہی نہیں آتی' حقیقی ایمان کے بھی بے شمار مراتب و مدارج ہیں۔ چنانچہ ایک ایمان ہما شما کا ہے اور ایک ایمان صدیق اکبر حضرت ابو بکر ؓ کا —— اور پھر ایک ایمان خود رسول اکرم ﷺ کا' بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۸۵) ''ایمان لائے رسول ﷺ اس پر کہ جو نازل کیا گیا ان پر ان کے رب کی جانب سے اور ایمان لائے اہل ایمان!'' —— اور ان کے مابین نسبت و تناسب کا معاملہ بالکل وہی ہے کہ: ''چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک!'' —— گویا ایمان کے مابین مراتب و مدارج بے شمار ہیں۔ البتہ اس کو اصولی طور پر دو درجوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے: ایک اپنی نوعیت کے اعتبار سے علم الیقین ہے اور دوسرا عین الیقین اور حق الیقین کا مجموعہ۔

واضح رہے کہ یوں تو امورِ ایمانی بہت سے ہیں' لیکن اصلاً ایمان نام ہے ایمان باللہ کا' اور ایمان بالآخرت ہو یا ایمان بالرسالت یہ دونوں ایمان باللہ ہی کی فروع (corollorics) ہیں۔ اس لیے کہ آخرت مظہر ہے اللہ کی صفت عدل کی اور رسالت مظہر ہے صفت ہدایت کی —— اب ایمان باللہ کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ انسان اللہ کے وجود اور اس کی صفات کو ان کے مظاہر و آثار سے مستنبط کرے' بقولِ شاعر: ع ''حق مری دسترس سے باہر ہے' حق کے آثار دیکھتا ہوں میں!'' —— یہ علم الیقین کا درجہ ہے —— یعنی معرفتِ الٰہی بذریعہ مشاہدۂ آیاتِ الٰہی اور واقعہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی ایک عظیم اکثریت کی رسائی بس یہیں تک ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان باللہ کے ضمن میں قرآن نے اسی اسلوب کو بتکرار و اعادہ اختیار فرمایا ہے۔ چنانچہ

مکی سورتوں میں وہ مضامین بکثرت اور شرح وبسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں جن کا خلاصہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۶۴ میں ایسی جامعیت کے ساتھ آیا ہے کہ اگر اسے ''آیت الآیات'' قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا:

﴿اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۪ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۶۴﴾﴾

''بے شک آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں، اور رات اور دن کے اُلٹ پھیر میں اور اُس کشتی میں جو لوگوں کے لیے نفع بخش سامان لیے دریا میں چلتی ہے، اور اللہ نے آسمان سے جو پانی اتارا اور زندہ کر دیا اُس سے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد اور پھیلا دیے اس میں تمام اقسام کے جانور، اور ہواؤں کے چلنے میں اور بادل میں جو مسخر ہے آسمان اور زمین کے درمیان، نشانیاں ہیں عقل سے کام لینے والوں کے لیے!''

الغرض آیاتِ آفاقی پر تعقّل و تفکّر کے ذریعے بھی یقیناً ایمانِ حقیقی پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ ہے بہرحال 'علم الیقین' ہی کے درجے میں، اور یہ سمجھنا غلطی ہی نہیں بہت بڑی گمراہی ہے کہ ایمان باللہ کا آخری درجہ یہی ہے۔ اللہ کی ہستی اور اس کے وجود کا یقین انسان کو 'عین الیقین' بلکہ 'حق الیقین' کے درجے تک بھی حاصل ہو سکتا ہے بشرطیکہ انسان بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۲۱﴾﴾ (الذّٰریٰت) اور بقول علامہ اقبال مرحوم ع ''اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی!'' اپنے باطنی شعور کو اجاگر کرے اور دل کی آنکھ سے جمالِ الٰہی کا مشاہدہ کرے۔ چنانچہ یہی وہ بات ہے جسے علامہ اقبال مرحوم نے اپنے اس جدید علم الکلام کی اساس بنایا ہے جس کے اصول و مبادی انہوں نے اپنے مشہورِ زمانہ لیکچرز میں معین کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی یہ کہ مشاہدہ صرف خارجی نہیں ہوتا باطنی بھی ہوتا ہے ___ اور تجربہ صرف مادی اور حسی ہی نہیں ہوتا قلبی و روحانی بھی ہوتا ہے اور اس حسِ باطنی کے اعتبار سے ایمان باللہ معقولات اور تصورات کے دائرے سے نکل کر محسوسات و مشاہدات کے دائرے میں آ جاتا ہے اور ایمان بندۂ مؤمن کا قال ہی نہیں حال بن جاتا ہے۔

یہ بات کہ ایمان 'عین الیقین' اور 'حق الیقین' کے درجے کو پہنچ سکتا ہے صحابہ کرام رضی اللہ

تعالیٰ عنہم اجمعین کے احوال سے تو روزِ روشن کی طرح ثابت ہے ہی، نبی اکرم ﷺ کی اس مشہور اور متفق علیہ حدیث سے نقلاً بھی ثابت ہے، جسے 'حدیثِ جبریل' سے موسوم کیا جاتا ہے اور جسے محدثین نے اس کے مضامین کی اہمیت اور جامعیت کے پیشِ نظر ''اُمُّ السُّنّۃ'' قرار دیا ہے۔ اس میں حضرت جبریل علیہ السلام کے اس سوال کے جواب میں کہ: ''اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِحْسَانِ!'' یعنی ''مجھے احسان کے بارے میں بتائیے!'' ___ آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ)) یعنی: ''یہ کہ تو اللہ کی اطاعت و عبادت میں اس شدتِ یقین سے سرگرم ہو جائے کہ جیسے تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو!''

الغرض یہ ہے ایمان باللہ کا وہ درجہ جسے 'عین الیقین' اور 'حق الیقین' سے تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جہاں پہنچ کر انسان خود مجسم یقین بن جاتا ہے، اور یقین انسان کے روئیں روئیں سے پھوٹنے لگتا ہے۔ چنانچہ نہ یہ بات غلط ہے کہ ع ''نگاہِ مردِ مؤمن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!'' ___ اور نہ ہی یہ کوئی انہونی بات ہے کہ: ''یقیں پیدا کر اے ناداں، یقیں سے ہاتھ آتی ہے ___ وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری!'' ___ البتہ یہاں تک رسائی ہر کس و ناکس کو حاصل نہیں ہو سکتی، یہ درجہ صرف خواص کا ہے اور ظاہر ہے کہ: ﴿وَقَلِیۡلٌ مَّا ہُمۡ﴾

یہاں مختصراً یہ بھی بیان ہو جائے تو مناسب رہے گا کہ قرآن حکیم ایمان بالآخرت کے ضمن میں خاص طور پر ''یقین'' کا ذکر کیوں کرتا ہے۔ دراصل عوامی سطح پر انسانوں کے عمل پر سب سے گہری چھاپ جس ایمان کی پڑتی ہے وہ ایمان بالآخرت ہی ہے۔ لہٰذا وہ عوام الناس بھی جن کا ایمان ابھی اقرارٌ باللسان یا شہادت ہی کے درجے میں ہو، اپنے عمل کی درستی کے لیے محتاج ہیں کہ کم از کم آخرت کے ضمن میں ان کا ایمان ''علم الیقین'' کے درجے کو لازماً پہنچ جائے ورنہ ایمان کے کوئی اثرات ان کے افعال و اعمال پر قطعاً مترتب نہ ہوں گے ___ یہی وجہ ہے کہ سورۃ البقرۃ کے آغاز میں بھی ایمان بالآخرت کے ضمن میں فرمایا: ﴿وَبِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؕ﴿۴﴾﴾ اور اسی طرح سورۂ لقمان کے آغاز میں بھی فرمایا: ﴿وَہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ یُوۡقِنُوۡنَ ؕ﴿۴﴾﴾ اور سورۃ الجاثیہ میں بھی منکرین قیامت کے ذکر میں فرمایا:

﴿وَاِذَا قِیۡلَ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ وَّ السَّاعَۃُ لَا رَیۡبَ فِیۡہَا قُلۡتُمۡ مَّا نَدۡرِیۡ مَا السَّاعَۃُ ۙ اِنۡ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحۡنُ بِمُسۡتَیۡقِنِیۡنَ ﴿۳۲﴾﴾

''اور جب کہا گیا کہ اللہ کا وعدہ حق ہے اور قیامت کے وقوع میں کوئی شک نہیں تو تم

نے کہا: ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہے' صرف ایک خیال سا تو ہمیں ہوتا ہے' لیکن یقین نہیں آتا!''

قصہ مختصر نبی اکرمﷺ اور قرآن حکیم کے حوالے سے بات ہو تو یقین کے لیے وسیع تر اور کثیر الاستعمال اصطلاح تو ایمان ہی کی ہے' لیکن ایمان کا جو پہلو انسانی شخصیت کے سعی و عمل والے پہلو سے متعلق ہے وہ یقینِ قلبی سے عبارت ہے' اور اس کا لازمی نتیجہ وہ ہے جسے قرآن جہاد یا مجاہدہ فی سبیل اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔

ایمان اور جہاد کے باہمی لزوم کے ضمن میں اس سے قبل قرآن حکیم کے تین مقامات کا حوالہ دیا جا چکا ہے' لیکن ان میں سے اہم ترین مقام سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ ہے جس میں 'مؤمن حقیقی' کی ''جامع و مانع'' تعریف بیان ہوئی ہے۔ اس لیے بھی کہ اس کے آغاز و اختتام دونوں پر حصر کا اسلوب موجود ہے۔ یعنی آغاز بھی ہے کلمۂ ''اِنَّمَا'' سے اور اختتام پر بھی اسم اشارہ ''اُولٰٓئِکَ'' پر اضافہ فرمایا گیا ہے اسم ضمیر ''ھُمْ'' کا۔ گویا ترجمہ ہوگا کہ: ''مؤمن تو بس وہی ہیں!'' اور ''صرف وہی لوگ سچے ہیں!'' —— اور اس لیے بھی کہ اس سے قبل والی آیت یعنی آیت ۱۴ میں قرآن کے عام طرزِ بیان کے خلاف 'ایمان' اور 'اسلام' کا ذکر مقابلتاً کیا گیا ہے اور ایک کی نفی کلی کے باوصف و باوجود دوسرے کا اثبات کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰکِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا ؕ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾﴾

''یہ بدو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے (اے نبیﷺ!) کہہ دیجیے کہ تم ایمان ہرگز نہیں لائے ہو' بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لے آئے ہیں اور ابھی تک تو ایمان تمہارے دلوں میں داخل بھی نہیں ہوا۔ البتہ اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر کاربند رہو تو وہ تمہارے اعمال (کے اجر و ثواب) میں سے کچھ کم نہ کرے گا۔ یقیناً اللہ بخشنے والا ہے' رحم فرمانے والا۔''

اس سلسلۂ کلام میں آپ سے آپ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقی ایمان کسے کہتے ہیں اور حقیقی مؤمن کی تعریف کیا ہے؟ —— چنانچہ اس سوال کا جواب ہے جو اگلی آیت میں دیا گیا۔ یعنی:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰھَدُوْا

بِاَمْوَالِھِمْ وَ اَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾ (الحجرات)

''مؤمن تو بس وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ پر اور اُس کے رسول پر' پھر شک میں نہیں پڑے' اور جہاد کیا انہوں نے اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔ صرف یہی لوگ (دعوائے ایمان میں) سچے ہیں!''

اس آیۂ مبارکہ میں ''لَمْ یَرْتَابُوْا'' کے الفاظِ مبارکہ نے ایمان کے ''یقین'' والے پہلو کو بالکل متعین کر دیا ہے' اور اس کے بعد کے الفاظ نے واضح کر دیا ہے کہ ایمانِ حقیقی کا لازمی نتیجہ جہاد و مجاہدہ فی سبیل اللہ ہے۔

جہاد یا مُجاہدہ —— 'جُہد' کے مادے سے باب مفاعلہ کا مصدر ہے' جس کے خواص میں مشارکت بھی ہے اور مقابلہ بھی! یعنی ایک ایسی عملی کیفیت جس میں دو فریق شریک ہوں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانے یا ایک دوسرے کو زک پہنچانے کے درپے ہوں۔ جیسے قتل ایک یک طرفہ فعل ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کو قتل کر دیتا ہے' بغیر اس کے کہ وہ بھی اس کے قتل کا ارادہ رکھتا ہو۔ جبکہ قتال یا مقاتلہ ایک دو طرفہ عمل ہے جس میں دو فریق ایک دوسرے کے قتل کے ارادے ہی سے میدان میں اترتے ہیں۔ اسی طرح بحث ایک یک طرفہ فعل ہے جس میں ایک شخص کسی مسئلے کے بارے میں کھود کرید کر رہا ہوتا ہے —— اور مباحثہ میں دو فریق شریک ہوتے ہیں اور دونوں اپنے موقف کو درست اور فریق مقابل کے موقف کو غلط ثابت کرنے پر تُلے ہوتے ہیں' اسی طرح 'جُہد' ایک یک طرفہ عمل ہے جس کا ترجمہ اردو یا فارسی میں 'کوشش' ہوگا۔ جبکہ جہاد یا مجاہدہ ایک دو طرفہ عمل ہے جس کا ترجمہ اردو یا فارسی میں 'کشمکش' (یا کشاکش) ہوگا اور انگریزی میں to struggle۔

ایمانِ حقیقی یا یقینِ قلبی کے نتیجے میں جو کشمکش یا تصادم پیدا ہوتا ہے اس کا اوّلین میدانِ کار انسان کی اپنی داخلی شخصیت ہے۔ جیسے ہی انسان کے قلب و ذہن نورِ ایمان سے منور ہوتے ہیں' اس کے سفلی جذبات و خواہشات کے طوفان اس روشنی کو گل کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں۔ انسان کی حیوانی شخصیت یا libido کی گہرائیوں اور اس کے اندھیاروں کا مشاہدہ دورِ جدید کے علمائے نفسیات نے خوب کیا ہے' اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ ان کی کیفیت فی الواقع وہی ہے جو قرآن حکیم کی اس تمثیل میں بیان ہوئی ہے کہ:

﴿اَوْ کَظُلُمٰتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ یَّغْشٰہُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِہٖ

سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌۢ بَعۡضُهَا فَوۡقَ بَعۡضٍ ؕ ﴾ (النور: ۴۰)

''یا جیسے اندھیرے گہرے سمندر میں' چھائی ہوئی ہو اس پر ایک موج' اور اس پر پھر ایک اور موج' اور پھر اس پر ایک بدلی' گویا اندھیرے ہوں بعض پر بعض' تہ در تہ!''

اس پس منظر میں بخوبی سمجھا جا سکتا ہے کہ جیسے ہی انسان کے قلب و ذہن میں نورِ ایمان و یقین کی شمع روشن ہوتی ہے' شہوات و خواہشات کی ظلمات کے ساتھ اس کی کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ جہاد یا مجاہدہ ہے جسے نبی اکرم ﷺ نے 'افضل الجہاد' قرار دیا ہے۔ یعنی جب آپؐ سے سوال کیا گیا: اَیُّ الۡجِهَادِ اَفۡضَلُ یَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ((اَنۡ تُجَاهِدَ نَفۡسَكَ فِیۡ طَاعَةِ اللّٰهِ))۔

اس جہاد میں جب اللہ انسان کو کامیابی عطا فرما دیتا ہے اور انسان کے نفسِ اَمّارہ پر قلب و روح کی تجلیات غالب آ جاتی ہیں تو اس کا اوّلین نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان کا اپنا عمل درست ہو جاتا ہے' گناہ اور معصیت سے نجات مل جاتی ہے اور انسانی شخصیت خیرات و حسنات کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔ چنانچہ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں بھی بے شمار مقامات پر ایمان کے فوراً بعد عمل صالح کے ذکر کے ذریعے واضح کی گئی ہے اور حدیث شریف میں بھی مثبت پیرائے میں بھی بیان ہوئی ہے' مثلاً اس سوال کے جواب میں کہ 'اَیُّ الۡاِیۡمَانِ اَحۡسَنُ!'' (یعنی اچھا ایمان کون سا ہے؟) آپؐ نے فرمایا: ((خُلُقٌ حَسَنٌ)) یعنی ''وہ جس کے نتیجے میں اخلاقِ حسنہ پیدا ہوں'' —— اور منفی پیرائے میں بھی بیان ہوئی ہے۔ جیسے وہ مشہور روایت جس کی رو سے حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ کبھی شاذ ہی ایسا ہوا ہو گا کہ حضور ﷺ نے ہمیں خطبہ ارشاد فرمایا ہو اور اس میں یہ الفاظ نہ فرمائے ہوں کہ: ((لَا اِیۡمَانَ لِمَنۡ لَا اَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِیۡنَ لِمَنۡ لَا عَهۡدَ لَهٗ)) ''جس شخص میں امانت داری نہیں اس کا ایمان نہیں اور جس میں ایفائے عہد کا مادہ نہیں اس کا کوئی دین نہیں!'' یا وہ مشہور اور متفق علیہ حدیث جس کی رو سے آپ ﷺ نے فرمایا: ((وَاللّٰهِ لَا یُؤۡمِنُ —— وَاللّٰهِ لَا یُؤۡمِنُ —— وَاللّٰهِ لَا یُؤۡمِنُ!)) (خدا کی قسم' وہ مومن نہیں —— خدا کی قسم' وہ مومن نہیں —— خدا کی قسم' وہ مومن نہیں!) پوچھا گیا: ''مَنۡ یَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ'' (حضور ﷺ کون؟) تو آپؐ نے فرمایا: ((اَلَّذِیۡ لَا یَاۡمَنُ جَارُهٗ بَوَائِقَهٗ)) (وہ کہ جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی امن میں نہ ہو!)

الغرض —— ایمان جب یقینِ قلبی کی صورت اختیار کرتا ہے تو اس کا پہلا نتیجہ نکلتا ہے

عمل کی درستی اور انسانی شخصیت کی تزئین و آرائش' عاداتِ حسنہ اور اخلاقِ فاضلہ سے' اور اس کے بعد شروع ہوتا ہے عالم خارجی میں جہاد یا مجاہدہ فی سبیل اللہ کا سلسلہ۔

اس جہاد فی سبیل اللہ کا اوّلین قدم وہ ہے جسے سورۃ العصر میں تعبیر فرمایا گیا ''تواصی بالحق'' اور ''تواصی بالصبر'' سے یا سورۃ البلد میں بیان کیا گیا ''تواصی بالصبر'' اور ''تواصی بالمرحمہ'' کے الفاظ سے' یا متعدد مقامات پر بیان کیا گیا 'امر بالمعروف' اور 'نہی عن المنکر'' کی اصطلاحات کے حوالے سے' یا کہیں تعبیر فرمایا گیا: ''دعوت الی الخیر' یا ''دعوت الی اللہ'' کے الفاظ سے —— اللہ اور آخرت پر ایمان و یقین کے نور کو جیسے ہی انسانی شخصیت میں تمکّن و قرار حاصل ہو جاتا ہے اس کا ظہور آپ سے آپ خارج میں بھی شروع ہو جاتا ہے۔ بالکل ایسے جیسے کوئی مادی چیز جب خود گرم ہو جائے تو اس سے حرارت خود بخود ماحول میں سرایت کرنا شروع کر دیتی ہے اور پھر جیسے جیسے اس کی حرارت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے' ماحول میں حرارت کا اثر و نفوذ بھی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ البتہ اس میں ایک اضافی شدت پیدا ہوتی ہے ایمان بالرسالت کے حوالے سے۔ یعنی یہ کہ برائی کے خلاف جہاد اور خیر اور بھلائی کی جانب دعوت تو عین انسانی فطرت کا بھی تقاضا ہے اور ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت سے اس میں مزید نکھار بھی پیدا ہو جاتا ہے' لیکن جب کوئی نبی یا رسول مامور من اللہ ہو کر اس فریضے کو سرانجام دیتا ہے تو اس کا ہدف و مقصود یہ بن جاتا ہے کہ خلقِ خدا پر اتمامِ حجت ہو جائے اور لوگ محاسبۂ اُخروی کے وقت کوئی عذر پیش نہ کر سکیں' بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ لِئَلَّا یَکُوۡنَ لِلنَّاسِ عَلَی اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعۡدَ الرُّسُلِ ؕ وَ کَانَ اللّٰهُ عَزِیۡزًا حَکِیۡمًا ﴿۱۶۵﴾﴾ (النساء)

''رسول بشارت دینے والے اور خبردار کر دینے والے بنا کر بھیجے گئے تا کہ رسولوں کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی دلیل باقی نہ رہ جائے۔''

اسے اصطلاحِ قرآنی میں ''شہادت علی الناس'' سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسی کو اب آنحضور ﷺ پر ختم نبوت اور تکمیل رسالت کے بعد اُمتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود قرار دیا گیا ہے —— بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿وَکَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوۡنُوۡا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَهِیۡدًا ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۴۳)

''اسی طرح ہم نے بنایا ہے تمہیں درمیانی امت تا کہ تم بن جاؤ گواہ پوری نوعِ انسانی پر—اور رسول بن جائیں گواہ تم پر!''

اور اسی کے لیے سعی و جُہد اور جہاد و مجاہدہ کے لیے للکارا گیا ہے مسلمانوں کو سورۃ الحج کی اس آخری آیت میں جس کے آغاز میں فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾

''اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں (اس مقصد کے لیے) منتخب کر لیا ہے۔''

اور آخر میں اس کا ہدف و مقصود معین کر دیا گیا ان الفاظ میں کہ: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ﴾ ''تا کہ بن جائیں رسولؐ گواہ تم پر اور بن جاؤ تم گواہ پوری نوعِ انسانی پر!''——اور اس پر بھی اکتفا نہیں۔ اس جہاد و مجاہدہ فی سبیل اللہ کا آخری ہدف اور مقصود وہ ہے جسے سورۃ المدثر میں تعبیر فرمایا گیا: ﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ③﴾ کے حد درجہ مختصر لیکن نہایت جامعیت اور فصاحت و بلاغت کے حامل الفاظ سے' یعنی اللہ کی کبریائی کا اقرار و اعلان اور اس کا بالفعل قیام و نفاذ —— اور جو سورۃ الصف' سورۃ الفتح اور سورۃ التوبہ میں بیان کیا گیا: ''اِظهار دين الحق على الدّين كُلّه!'' کی جامع اصطلاح کے حوالے سے' بفحوائے الفاظ قرآنی: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَي الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ﴾ ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ (یعنی قرآن مجید) اور دین حق (یعنی اسلام کا نظامِ عدل اجتماعی) دے کر تا کہ غالب و قائم کر دیں اسے پورے کے پورے نظامِ زندگی پر!''

اور یہ امر ظاہر ہے کہ ایک عظیم انقلاب کا متقاضی ہے —— جس کے لیے ایک بھرپور انقلابی جدوجہد ناگزیر ہے۔ گویا ایمانِ حقیقی یا یقین قلبی کا لازمی نتیجہ ہے ایک عظیم انقلابی جدوجہد جس سے مقصود آخرت میں جہنم سے نجات اور رضائے الٰہی کا حصول ہو۔ اور جس کا ہدف اس دنیا میں وہ ہو جسے آنحضورﷺ نے تعبیر فرمایا: ((لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا!)) —— کے الفاظ سے' یعنی تا کہ اللہ کا کلمہ ہی سربلند ہو۔ اور اس کے جھنڈے سے اونچا کوئی جھنڈا نہ رہ جائے۔

آخر میں اگر ایک اور اہم حقیقت کی جانب بھی اشارہ ہو جائے تو بات مکمل ہو جائے کہ

اس ایمان کا منبع اور یقین کا سرچشمہ ہے قرآن حکیم۔ بقول مولانا ظفر علی خاں مرحوم ومغفور ؎

وہ جنس نہیں ایمان جسے لے آئیں دکانِ فلسفہ سے
ڈھونڈے سے ملے گی عاقل کو یہ قرآں کے سیپاروں میں!

یہی وجہ ہے کہ آنحضورﷺ کا پورا عمل دعوت و تربیت گھومتا ہے قرآن مجید کے گرد اور آپؐ کی پوری انقلابی جدوجہد کا مرکز و محور ہے قرآن حکیم۔ بفحوائے الفاظ قرآنی:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۤ﴾ (الجمعۃ:۲)

''تلاوت کرتا ہے وہ ان پر اللہ کی آیات اور تزکیہ کرتا ہے ان کا اور تعلیم دیتا ہے انہیں کتاب اور حکمت کی۔''

گویا آپﷺ کا آلۂ انقلاب قرآن مجید ہے! —— بقول مولانا حالی مرحوم ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا — اور اِک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

تو اب مردِ مؤمن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ چشم تصور کے سامنے آئے گا اس کے ایک ہاتھ میں قرآن ہو گا اور دوسرے میں تلوار۔ قرآن خود اس کے ذاتی یقین کا منبع و سرچشمہ بھی ہے اور اس کے ذریعے وہ دنیا سے جہالت کی تاریکیاں فرو کرتا ہے اور تلوار علامت (symbol) ہے اس کے جذبہ سعی و عمل اور جوشِ جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے لیے —— اور اس کا مطلوب و مقصود ہے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے الفاظ کی رو سے:

اِنَّا قَدْ اُرْسِلْنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمٰتِ الْجَهَالَةِ اِلٰى نُوْرِ الْاِيْمَانِ وَمِنْ جَوْرِ الْمُلُوْكِ اِلٰى عَدْلِ الْاِسْلَامِ

''ہم اس لیے بھیجے گئے ہیں کہ لوگوں کو نکالیں جہالت کی تاریکیوں سے ایمان کی روشنی کی جانب اور نجات دلائیں انہیں بادشاہوں کے ظلم و ستم سے اور روشناس کریں اسلام کے نظامِ عدل سے۔''

گویا بقول ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم ؎

مری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں' میں اسی لیے نمازی!

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

واخر دعوانا ان الحمد للّٰه ربّ العلمين

تقویٰ کا لباس

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر☆

تقویٰ کا مفہوم

تقویٰ، عربی لفظ وقایہ سے بنا ہے، جس کا معنیٰ ڈھال ہے۔ ڈھال میدانِ جنگ میں دشمن کے وار سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے استعمال ہوتی ہے اور تقویٰ بھی دراصل اللہ کا وہ ڈر اور خوف ہے، جس کے ذریعے انسان شیطان کے مکر وفریب اور چالوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اہلِ علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ تقویٰ دل کا فعل ہے یا اعضاء کا۔ تقویٰ کوئی جذبہ ہے جو دل میں ہوتا ہے یا یہ ایک رویہ ہے جس کا اظہار انسان کے عمل سے ہوتا ہے؟ کتاب وسنت کی نصوص میں تقویٰ کو جذبہ اور رویہ دونوں طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ تقویٰ دراصل دل کے افعال میں سے ایک فعل ہے، کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((اَلتَّقْوٰی هَاهُنَا)) وَيُشِيْرُ اِلٰی صَدْرِهٖ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ [۱]

''تقویٰ یہاں ہوتا ہے'' اور یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ تین مرتبہ اپنے سینے کی طرف اشارہ فرمارہے تھے۔''

دل میں جب یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا اظہار لازماً انسان کے اعضاء سے ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ مجھے سامنے موجود اپنے بچے پر پیار آئے اور میں اس کی طرف اپنے ہاتھ نہ بڑھاؤں۔ جب بھی مجھے کسی سے محبت محسوس ہوتی ہے یا کسی سے ڈر لگتا ہے تو میرے اعضاء سے اس محبت اور ڈر کا اظہار ہو کر رہتا ہے۔ پس یہی معاملہ تقویٰ کا بھی ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، کامساٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور
ای میل: mzubair@ciitlahore.edu.pk فیس بک: Hm Zubair

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم ظلم المسلم ......

دل میں حقیقتاً اللہ کا ڈر اور خوف ہو اور اعضاء سے اس کا اظہار نہ ہو رہا ہو۔ جس کے دل میں تقویٰ ہوگا تو اس کے رویے سے بھی لازماً اس کا اظہار ہوگا۔ پس تقویٰ کا تعلق دل کے علاوہ عمل سے بھی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠﴾

(المائدۃ:۲)

''اور نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو، اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔''

اس آیت مبارکہ میں تقویٰ سے مراد تقویٰ والے اعمال ہیں، یعنی وہ اعمال کہ جن کی بنیاد اللہ کا ڈر اور خوف ہو۔ اگر آپ کسی بری عادت کو اللہ کے ڈر کی وجہ سے ترک کر دیتے ہیں تو یہ تقویٰ ہے۔ کسی بری عادت کو تو اللہ کی محبت میں بھی ترک کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود اللہ کی ذات سے اس لیے ڈرایا گیا ہے کہ انسان خوف کی کیفیت میں زیادہ مفید (productive) عمل کرتا ہے۔ ماہرین نفسیات کا بھی یہی کہنا ہے۔ انسان کے عمل اور رویے میں کتنا تقویٰ ہونا چاہیے، تو اس بارے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝۱۰۲﴾ (آل عمران)

''اے اہلِ ایمان! اللہ سے ڈرو جتنا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، اور تم ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ فرمانبردار ہو۔''

اب اس ڈرنے سے مراد صرف دل میں ڈرنا نہیں ہے، بلکہ ایسا ڈرنا ہے کہ جس کا اثر انسان کے اعمال پر اس قدر ہو کہ وہ ہر حال میں اللہ کی فرمانبرداری کی حالت میں ہو۔ وہ حالت کہ جس میں انسان اللہ کی معصیت اور نافرمانی میں ہو، تقویٰ کی حالت نہیں ہوتی۔ اور اللہ عزوجل نے ہم سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ جب ہماری موت واقع ہو تو اُس وقت ہمیں تقویٰ کے حال میں ہونا چاہیے۔ اور تقویٰ کا حال اللہ کی فرمانبرداری کی حالت ہے۔ انسان جب بھی اللہ کے کسی حکم کو پورا کر رہا ہو، مثلاً نماز پڑھ رہا ہے، تلاوت کر رہا ہے، ذکر کر رہا ہے، حج وعمرہ کر رہا ہے، زکوٰۃ وصدقہ ادا کر رہا ہے، بھلائی کا کام کر رہا ہے، دعوت وتبلیغ کا حکم پورا کر رہا ہے، ظالم کافروں سے جہاد کر رہا ہے، تو وہ تقویٰ کے کسی نہ کسی حال میں ہوتا ہے۔

تقویٰ کی اہمیت

تقویٰ کا لفظ قرآن مجید میں نو مرتبہ نقل ہوا ہے‘ جبکہ تیرہ مرتبہ ان لوگوں کا بیان ہے کہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے یا جنہیں تقویٰ اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے —— قرآن مجید میں ۶۹ مرتبہ امر کے صیغہ میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور قرآن مجید میں ۵۳ مقامات ایسے ہیں کہ جہاں متقین کی صفات یا ان کے مقام اور مرتبے کا بیان ہے۔ ان اعداد و شمار سے قرآن مجید کے حوالے سے تقویٰ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق ہر نبیؑ نے اپنی قوم کو تقویٰ کی وصیت کی ہے۔ ہر نبی کی دعوت کے دو بڑے موضوع رہے ہیں: ایک اللہ کی عبادت کرنا‘ جسے ہم توحید بھی کہہ دیتے ہیں اور دوسرا اللہ کا تقویٰ اختیار کرنا۔ اللہ عزوجل ہی کی عبادت کے بعد‘ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم‘ قرآن مجید کے اہم موضوعات میں سے ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ﴾ (النساء: ۱۳۱)

’’اور ہم نے ان لوگوں کو بھی وصیت کی کہ جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمہیں بھی یہ وصیت کر رہے ہیں کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو!‘‘

اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کی دعوت کا بنیادی نکتہ عبادت کے علاوہ تقویٰ بھی رہا ہے۔ قومِ نوحؑ کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۰۶﴾﴾ (الشعراء)

’’جب ان سے ان کے بھائی نوح (علیہ السلام) نے کہا کہ تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟‘‘

اسی طرح قومِ عاد کے بارے میں ارشاد ہوا:

﴿اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ هُوْدٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾﴾ (الشعراء)

’’جب ان سے ان کے بھائی ہود (علیہ السلام) نے کہا کہ تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟‘‘

اسی طرح قومِ ثمود کے بارے میں فرمایا:

﴿اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ صٰلِحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۴۲﴾﴾ (الشعراء)

’’جب ان سے ان کے بھائی صالح (علیہ السلام) نے کہا کہ تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟‘‘

اسی طرح قومِ لوطؑ کے بارے میں فرمایا:

﴿اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ﴿۱۶۱﴾﴾ (الشعراء)

’’جب ان سے ان کے بھائی لوط (علیہ السلام) نے کہا کہ تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟‘‘

پس انبیاء کرام علیہم السلام کے تربیتی نظام اور قرآن مجید کے متعین کردہ راہِ سلوک میں تقویٰ ہی ابتدا وانتہا ہے۔ تقویٰ کی ابتدا یہ ہے کہ انسان فرائض کا اہتمام کرے اور حرام کاموں سے اجتناب کرے اور اس کی انتہا یہ ہے کہ شبہات سے بھی بچے اور دینی شعائر کی بھی تعظیم کرے۔ قرآن مجید کے بیان کردہ راہِ سلوک کا یہ ابتدائی پتھر بھی ہے اور انتہائی منزل بھی۔ قرآن مجید کا کل راہِ سلوک یہی تقویٰ ہے اور تقویٰ کا کل مقصود یہ ہے کہ دل اور عمل سے متقی بن جاؤ۔ اب ہم لوگوں کو غوث‘ قطب‘ ابدال اور قلندر بنانے میں لگے ہیں کہ جن کا ذکر نہ تو قرآن مجید میں ہے اور نہ ہی احادیث میں۔ اور جن مقاماتِ سلوک کا ذکر قرآن مجید میں ہے‘ ان کی طرف بالکل بھی توجہ نہیں۔ پس تصوف کے نام پر کچھ لوگوں نے قرآن مجید کے متوازی ایک نظامِ تربیت قائم کر لیا ہے کہ جس میں لوگ غوث‘ قطب‘ ابدال اور قلندر تو بنتے ہیں لیکن مریدوں کو مؤمن‘ محسن‘ متقی‘ عباد الرحمٰن وغیرہ بنانے کی فکر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ قرآن مجید جہاں اپنے مقاماتِ سلوک کا تذکرہ کرتا ہے‘ وہاں ان مقامات کو حاصل کرنے کے لیے رستے کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ قرآن مجید نے جہاں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے‘ وہاں کثرت سے متقین کی صفات بھی بیان فرمائی ہیں کہ ان صفات کے ساتھ متصف ہو کر تم اس مقامِ بندگی پر فائز ہو سکتے ہو‘ کہ جو بندگی کا سب سے پہلا مقام بھی ہے اور سب سے اعلیٰ مقام بھی۔

قرآن مجید نے تقویٰ کا اس قدر کثرت سے حکم دیا ہے کہ اگر سفر کے لیے گھر سے نکلے تو زادِ راہ کے ساتھ ساتھ تقویٰ کی بھی وصیت کر دی۔ زادِ راہ سے مراد وہ ضروری اشیاء ہیں کہ جن کی ایک مسافر کو راستے میں ضرورت پڑتی ہے۔ اگر آپ کو کہیں بھی سفر پر جانا ہے تو راستے کے لیے سامان تو باندھنا پڑتا ہے‘ اور راستے کے اس سامان میں اللہ عزوجل نے تقویٰ کو بھی شامل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ﴿۱۹۷﴾﴾ (البقرۃ)

’’اور (حج کے سفر میں) زادِ راہ لے لیا کرو جبکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے‘ اور میرا ہی تقویٰ اختیار کرواے ہوش مندو!‘‘

اسی طرح اگر کہیں انسان کے لباس کا تذکرہ آیا کہ اللہ عزوجل کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت لباس بھی ہے کہ انسان اس نعمت کے ساتھ اپنی زندگی کو خوبصورت بناتا ہے تو ساتھ میں ہی

بہترین لباس تقویٰ کو قرار دے دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیۡرٌ ؕ﴾ (الاعراف:۲۶)

’’اے اولادِ آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا ہے کہ جس سے تم اپنی شرم گاہوں کو چھپاتے ہو اور زینت حاصل کرتے ہو‘ لیکن تقویٰ کا لباس تو بہت ہی بہتر ہے۔‘‘

تقویٰ کو لباس سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح لباس تمہارے وجود کو ڈھانپ لیتا ہے اور انسان دن اور رات ہر دو اوقات میں لباس پہنے ہوتا ہے‘ اسی طرح تقویٰ کو بھی اپنا لباس بنالو کہ ہر حال میں تقویٰ کی چادر میں تمہارا نفس لپٹا ہوا ہو۔ جس طرح لباس تمہارے وجود سے جدا ہو تو تمہیں بے چینی شروع ہو جاتی ہے تو اسی طرح تقویٰ اگر تمہارے دل سے نکل جائے تو تم اضطراب کی کیفیت میں آ جاؤ۔

اللہ عزوجل کو ہم سے محض نیکی مطلوب نہیں ہے‘ بلکہ ایسی نیکی مطلوب ہے کہ جو تقویٰ کے ساتھ ہو۔ تقویٰ کے بغیر نیکی محض ایک رسم رہ جاتی ہے کہ جس سے انسانی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی نماز‘ روزہ‘ صدقہ‘ زکوٰۃ‘ حج‘ عمرہ‘ تلاوت‘ ذکر‘ دعوت اور تبلیغ وغیرہ جیسے نیک اعمال آپ کی شخصیت میں تبدیلی لے کر آئیں تو یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ آپ ہر نیک عمل کی بنیاد تقویٰ کو بنالیں۔ تقویٰ کسی بھی نیک عمل کی روح ہے اور تقویٰ کے بغیر نیکی ایسے ہی ہے جیسا کہ روح کے بغیر مردہ جسم۔ تقویٰ دراصل عبادت کا ایک ایسا حال ہے کہ اگر وہ حاصل ہو جائے تو انسان کی عبادت قبولیت کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ اللہ کے لیے جانور ذبح کرنا‘ جسے ہم قربانی کہتے ہیں‘ ایک بہت بڑا نیک عمل ہے جو کہ عیدالاضحیٰ کے موقع پر پوری دنیا میں ذوق وشوق سے پورا کیا جاتا ہے۔ اور اس بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُہَا وَ لَا دِمَآؤُہَا وَ لٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ ؕ﴾ (الحج:۳۷)

’’اللہ عزوجل کو ان جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ وہ تقویٰ پہنچتا ہے جو تم میں ہوتا ہے۔‘‘

جانور کی گردن پر چھری پھیرتے وقت انسان یہ عزم کرے کہ جس طرح اس جانور کو اللہ کے لیے قربان کر دیا‘ اسی طرح اپنی ان خواہشات کو بھی اللہ کے لیے قربان کر دوں گا جو اس سے دور کرنے کا سبب بنتی ہوں۔ اور آج اگر اس جانور کا خون اللہ عزوجل کی خاطر بہایا ہے تو کبھی

اللہ عزوجل کے لیے اپنا خون دینے کی ضرورت بھی پڑی‘ مثلاً جہاد وغیرہ میں‘ تو اسی طرح پیش کردوں گا کہ جیسے اس جانور کا خون پیش کیا۔ تو یہ وہ جذبات اور سوچیں ہیں جو نیکی میں تقویٰ کو شامل کر دیتے ہیں۔ اور اگر قربانی کے اس عظیم عمل میں یہ سوچ غالب ہو کہ اس کا گوشت اتنے دنوں تک گھر کے فریزر میں رکھا جا سکتا ہے تو یہ صرف رسم قربانی ہے کہ جس کی روح غائب ہے۔ اور قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ تو ہلا دینے والی ہے کہ اللہ عزوجل تو نیک عمل قبول ہی اس سے کرتے ہیں کہ جو اس نیک عمل میں تقویٰ رکھتا ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا یَتَقَبَّلُ اللّٰہُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۲۷﴾﴾ (المائدۃ:۲۷)

’’اللہ عزوجل تو محض متقین سے ہی (نیک اعمال) قبول کرتے ہیں۔‘‘

اور اللہ عزوجل کے ہاں جو مقام اور مرتبہ طے ہوتا ہے تو اس کا واحد معیار تقویٰ ہے۔ اللہ عزوجل کے ہاں فضیلت اور مقام کا معیار انسان کا کچھ اور بننا نہیں‘ بلکہ اس کا متقی بننا ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ ؕ﴾ (الحجرات:۱۳)

’’بے شک اللہ عزوجل کے ہاں تم میں سے سب سے زیادہ مقام اور مرتبے والا وہ ہے کہ جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے۔‘‘

تقویٰ کے درجات

تقویٰ کے دو درجات ہیں: ایک بنیادی اور دوسرا انتہائی۔ بنیادی درجہ تو یہ ہے کہ انسان فرائض پر عمل پیرا ہو اور حرام سے اجتناب کرے۔ جو شخص بھی فرائض کو پورا کر رہا ہے اور حرام سے بچ رہا ہے تو وہ متقی ہے۔ اگر فرائض کی پابندی اور حرام سے اجتناب نہیں ہے تو پھر تقویٰ نہیں ہے‘ چاہے ساری رات سجدے کی حالت میں پڑا رہے اور سارا دن بھوکا پیاسا رہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز ؒ کا قول ہے:

لَيْسَ تَقْوَى اللّٰهِ بِصِيَامِ النَّهَارِ، وَلَا بِقِيَامِ اللَّيْلِ، وَالتَّخْلِيطِ فِيمَا بَيْنَ ذٰلِكَ، وَلٰكِنَّ تَقْوَى اللّٰهِ تَرْكُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ، وَأَدَاءُ مَا افْتَرَضَ اللّٰهُ، فَمَنْ رُزِقَ بَعْدَ ذٰلِكَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ إِلٰى خَيْرٍ (۱)

’’تقویٰ یہ نہیں ہے کہ انسان دن میں روزے سے رہے یا رات بھر تہجد پڑھے یا دونوں

(۱) البیہقی‘ احمد بن الحسین بن علی‘ الزھد الکبیر‘ مؤسسة الکتب الثقافیة‘ بیروت‘ ص ۳۵۱۔

کام کرے‘ بلکہ اصل تقویٰ تو یہ ہے کہ حرام کو چھوڑ دے اور فرض کو ادا کرے۔ اور فرض کی ادائیگی اور حرام سے اجتناب کے بعد اگر کسی کو مزید نیکی کی توفیق ملے تو وہ نورٌ علیٰ نور ہے۔‘‘

پس تقویٰ کا بنیادی اور لازمی درجہ تو فرائض پر عمل پیرا ہونا اور حرام سے اجتناب کرنا ہے۔ جو شخص یہ دو کام نہ کرے تو بھلے وہ ہوا میں اُڑ کر دکھا دے‘ وہ اللہ کا ولی نہیں ہے بلکہ شیطان کا ولی ہے۔ ایک شخص نماز نہ پڑھے اور چرس پیے تو فاسق و فاجر تو ہو سکتا ہے لیکن متقی نہیں۔ متقی کہلوانے کے لیے ضروری ہے کہ ارکانِ اسلام یعنی نماز‘ روزہ‘ حج اور زکوٰۃ پر عمل پیرا ہو اور شرک‘ قتل‘ زنا‘ بے حیائی‘ چوری‘ ڈکیتی‘ سود‘ رشوت‘ بدعنوانی‘ جھوٹ‘ وعدہ خلافی‘ شراب نوشی اور منشیات وغیرہ کے استعمال کو ترک کرنے والا ہو۔

اور تقویٰ کا اعلیٰ ترین درجہ یہ ہے کہ انسان شبہات سے بھی بچے‘ یعنی جس کا حرام ہونا واضح نہ ہو لیکن اس کے حرام ہونے کا شبہ لاحق ہو جائے تو اس کو ترک کر دینا بھی تقویٰ ہے‘ جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ، وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَاَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ : كَرَاعٍ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى، يُوشِكُ اَنْ يُوَاقِعَهُ، اَلَا وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، اَلَا اِنَّ حِمَى اللّٰهِ فِي اَرْضِهِ مَحَارِمُهُ، اَلَا وَاِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً: اِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ)) (۱)

’’حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے‘ اور ان دونوں کے مابین کچھ امور مشتبہات میں سے ہیں کہ جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے۔ پس جس نے اپنے آپ کو مشتبہات سے بچا لیا تو اس نے اپنے دین کو بھی بچا لیا اور اپنی عزت کو بھی محفوظ کر لیا۔ اور جو مشتبہات میں پڑ گیا تو قریب ہے کہ وہ حرام میں بھی پڑ جائے‘ جیسا کہ ایک چرواہا کسی چراہ گاہ کے گرد اپنی بکریاں چراتا ہے تو اس کی بکریاں اس میں داخل ہو سکتی ہیں۔ سن لو کہ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی چراہ گاہ اس کی زمین میں وہ کام ہیں کہ جنہیں

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الایمان‘ باب فضل من استبرأ لدینه، ۱/ ۲۰

اس نے حرام قرار دیا ہے۔ خبردار! انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ خبردار! وہ اس کا دل ہے۔‘‘

پس مشتبہ امور سے بچنا تقویٰ کا اعلیٰ تر درجہ ہے۔ اسی طرح اگر کسی حلال اور مباح کام کے بارے میں اندیشہ ہو کہ یہ حرام تک جانے کا ذریعہ بن جائے گا تو اس حلال اور مباح سے اجتناب کرنا بھی تقویٰ میں شامل ہے۔ اگر آپ کو اندیشہ ہے کہ آپ انٹرنیٹ پر بیٹھیں گے تو اللہ کی حدود میں داخل ہو جائیں گے یعنی کسی فحش ویب سائیٹ پر پہنچ جائیں گے تو آپ کے لیے انٹرنیٹ پر نہ بیٹھنا تقویٰ میں شامل ہے‘ چاہے انٹرنیٹ کے استعمال اور جائز ہونے کے فتاویٰ موجود ہوں۔ لیکن یہ تقویٰ وہ ہے جو اپنے لیے ہے‘ نہ کہ دوسروں کے لیے۔ ہمارا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم بہترین تقویٰ چاہتے ہیں‘ لیکن دوسروں کی ذات میں‘ اپنی ذات میں نہیں۔ اور صالح بننے کے لیے ضروری ہے کہ تقویٰ کی آئیڈیل صورتیں‘ میں اپنی ذات میں پیدا کر کے دکھا دوں نہ کہ دوسروں میں تلاش کرتا رہوں اور نہ ملنے پر ان کو تنقید کا نشانہ بناتا رہوں۔

قرآن مجید نے بھی تقویٰ کے گھٹنے اور بڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ جب شراب کو حرام قرار دیا گیا تو اُس وقت بعض مسلمانوں کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ جو شراب ہم نے پی لی ہے وہ تو ہمارے خون کا حصہ بن چکی ہے لہٰذا اس کی نجاست اور گندگی سے ہمارے وجود کی صفائی کیسے ممکن ہے؟ تو اس بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ نازل ہوا:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾﴾ (المائدة)

’’اہل ایمان اور صالح عمل کرنے والوں پر اس بارے میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ جو وہ کھا پی چکے ہیں جبکہ وہ تقویٰ اختیار کریں اور ایمان اور عمل صالح میں بڑھ جائیں‘ اور پھر تقویٰ اور ایمان میں بڑھ جائیں‘ اور پھر مزید تقویٰ میں بڑھ جائیں اور درجہ احسان کو پہنچ جائیں۔ اور اللہ عزوجل درجہ احسان پر فائز ہونے والوں سے محبت کرتے ہیں۔‘‘

تقویٰ جب اپنے اعلیٰ درجے کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے مظاہر میں سے ایک اہم مظہر اللہ کے شعائر کی تعظیم ہے۔ شعائر کا لفظ شعور سے بنا ہے اور اس سے مراد وہ اشیاء ہیں کہ جنہیں دیکھتے ہی اللہ عزوجل کی ذات کا شعور حاصل ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴿۳۲﴾﴾ (الحج)

''اور جو کوئی اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا تو یہ دلوں کے تقویٰ میں سے ہے۔''

پس شعائر سے مراد وہ اشیاء ہیں کہ جن پر نظر پڑتے ہی اللہ یاد آ جائے' جیسا کہ بیت اللہ' مسجد اور قرآن مجید وغیرہ۔ پس ان کی تعظیم کرنا بھی تقویٰ میں شامل ہے۔ اگرچہ یہ کوئی شرعی مسئلہ تو نہیں ہے کہ انسان اپنے گھر میں موجود شیلف میں جب کتابیں رکھے تو سب سے پہلے قرآن مجید رکھے' پھر حدیث کی کتابیں اور پھر دیگر کتب رکھے' لیکن یہ ان آداب میں ضرور شامل ہے جو کہ تقویٰ کے اعلیٰ درجے کے ثمرات میں سے ہیں۔ پس بیت اللہ کی طرف اپنے پاؤں نہ پھیلانا' میز پر پڑی کتابوں میں قرآن مجید کو سب سے اوپر رکھنا' اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لکھے ہوئے نام کو زمین پر سے اٹھا لینا اور سنبھال کر اونچی جگہ پر رکھ دینا' مسجد میں اونچی آواز سے بات نہ کرنا وغیرہ' اللہ کے شعائر کی تعظیم کرنے میں شامل ہے۔

تقویٰ کے ثمرات

قرآن مجید نے تقویٰ کے جو ثمرات بیان کیے ہیں' وہ دُنیاوی بھی ہیں اور اُخروی بھی۔ متقی شخص کو ایک تو اس دنیا میں ہی کچھ انعامات کی صورت میں اس کے تقویٰ کا بدلہ دے دیا جاتا ہے اور دوسرا آخرت میں تو اس کے لیے خاص طور پر انعام واکرام کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تقویٰ کے دنیاوی ثمرات میں سے یہ ہے کہ اللہ عزوجل انسان کے لیے اس کی آزمائش سے نکلنے کا راستہ اور آسانی پیدا فرما دیتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ﴿۲﴾ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ﴾

(الطلاق:۳)

''اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ عزوجل اس کے لیے (آزمائش سے) نکلنے کا کوئی راستہ پیدا فرما دیں گے' اور اس کو وہاں سے رزق دیں گے جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہو گا۔''

اس سے اگلی آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ اَمْرِهٖ يُسْرًا ﴿۴﴾﴾ (الطلاق)

''اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ عزوجل اس کے معاملے میں آسانی پیدا فرما دیں گے۔''

یہ آیات میاں بیوی میں جدائی اور طلاق کے سیاق میں بیان ہوئی ہیں۔ عموماً میاں بیوی میں جدائی کے وقت ایک دوسرے کے حق میں صریح زیادتی ہو جاتی ہے' لہٰذا نبھا نہ ہونے کی صورت میں بہترین انداز میں علیحدہ ہو جانا تقویٰ میں شامل ہے۔ عموماً علیحدگی کی صورت میں شوہر کے گھر والے لڑکی کے جہیز کا سامان واپس نہ کریں یا شادی کی موقع پر جو تحفے تحائف لڑکی کو لڑکے والوں کے خاندان کی طرف سے دیے گئے تھے' انہیں واپس لینے کی کوشش کریں یا لڑکی والے علیحدگی کے بعد عدالت کے ذریعے بچے حاصل کر لیں اور باپ کو اپنے بچوں سے ملنے نہ دیں' تو یہ سب وہ کام ہیں جو تقویٰ کے منافی ہیں۔ اور جو شریک کار (partrners) تقویٰ کے ساتھ علیحدہ ہوتے ہیں کہ لڑائی اور جھگڑے میں بھی ایک دوسرے پر زیادتی نہ کریں تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے لیے اللہ عزوجل آزمائش سے نکلنے کے راستے پیدا فرما دیتے ہیں اور ان کے دنیاوی معاملات کو ان کے حق میں آسان فرما دیتے ہیں۔

تقویٰ کے دنیاوی فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ جب کوئی قوم تقویٰ اختیار کرتی ہے تو اللہ عزوجل اس کے لیے زمین اور آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیتے ہیں اور اس کی معیشت پھلنے پھولنے لگتی ہے۔ کسی قوم کی معیشت کے بہتر ہونے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اللہ عزوجل اس کے لیے زمین اور آسمان کی برکات کے دروازے کھول دیں' زمین تیل' گیس اور دیگر معدنی ذخائر کی صورت میں اپنے خزانے اُگل دے اور آسمان بارشوں کے ذریعے اس قوم کی نہروں اور دریاؤں کو جاری کر دے اور فصلوں اور باغات کو سونا بنا دے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ایک قوم دوسری اقوام کے وسائل اور ذرائع پر قبضہ کر کے اپنی معیشت کو تو بہتر بنا لے' لیکن دوسروں کی معیشت کا بیڑا غرق کر دے' جیسا کہ سرمایہ داری میں دنیا کی کل دولت میں سے ایک بڑے حصے کا ارتکاز چند اقوام تو کجا' چند خاندانوں بلکہ چند افراد کے ہاتھوں میں ہو جاتا ہے' جس سے دنیا کے بڑے بڑے خطوں اور اقوام میں بدترین غربت جنم لیتی ہے۔ تقویٰ اختیار کرنے کی صورت میں اللہ عزوجل قدرتی وسائل اور ذرائع آمدن میں اضافہ فرما دیتے ہیں جو کہ معاشی خوشحالی کی حقیقی صورت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْقُرٰٓى اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ وَلٰكِنْ كَذَّبُوْا فَاَخَذْنٰهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۶﴾﴾ (الاعراف)

''اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم لازماً ان پر آسمان اور

زمین کی برکات کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے انہیں اُس کے بدلے میں پکڑا جو کہ وہ کرتے تھے۔''

جہاں تک تقویٰ کے اُخروی اور دینی فوائد کا تعلق ہے تو اللہ عزوجل دنیاوی اور دینی معاملات میں تقویٰ اختیار کرنے سے گناہ معاف فرما دیتے ہیں اور اجر وثواب بڑھا دیتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗۤ اَجْرًا ۝۵﴾ (الطلاق)

''اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ عزوجل اس کے گناہ دور کر دیں گے اور اس کے اجر کو بڑھا دیں گے۔''

اس کے علاوہ قرآن مجید میں کئی ایک آیات ہیں کہ جن میں متقین کو صراحت کے ساتھ جنت کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ۝۶۳﴾ (مریم)

''اس جنت کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بنائیں گے جو متقی ہیں۔''

اسی طرح قرآن مجید میں کئی ایک مقامات پر آخرت میں متقین کو جنت میں ملنے والے انعامات واکرامات بیان کیے گئے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝۴۵ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ۝۴۶ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ
صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝۴۷ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا
هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ۝۴۸﴾ (الحجر)

''بے شک متقین باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ (اور ان سے کہا جائے گا کہ) تم جنت میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ اور ان کے دلوں میں جو کینہ ہوگا' اسے ہم کھینچ لیں گے اور وہ بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ انہیں اس جنت میں نہ تو کوئی تھکاوٹ طاری ہوگی اور نہ ہی وہ اس سے کبھی نکالے جائیں گے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۝۵۱ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝۵۲ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ
سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝۵۳ كَذٰلِكَ ۣ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝۵۴

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ۝۵۵ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ
الْاُوْلٰى ۚ وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝۵۶ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ
الْعَظِيْمُ ۝۵۷﴾ (الدخان)

''بے شک متقین باعزت مقام میں ہوں گے۔ باغات اور چشموں میں۔ وہ باریک اور موٹا ریشم پہن کر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ اسی طرح ہم موٹی آنکھوں والی حوریں ان کے نکاح میں دے دیں گے۔ وہ ان جنتوں میں ہر قسم کے پھل مانگے گے امن کے ساتھ۔ اور وہ ان جنتوں میں کبھی موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے سوائے اُس موت کے کہ جو پہلے ان پر آ چکی' اور ان کا رب انہیں جہنم کے عذاب سے بچا لے گا۔ اور یہ سب آپ کے رب کا فضل ہے' اور یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔''

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ۝۶۷ يٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ
عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ۝۶۸ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝۶۹
اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ۝۷۰ يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ
ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝۷۱ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝۷۲ لَكُمْ فِيْهَا
فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝۷۳﴾ (الزخرف)

''قیامت والے دن قریبی ترین دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے۔ اے میرے (متقی) بندو! آج کے دن تم پر نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی تم غمگین ہو گے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور فرمانبردار رہے۔ (ان سے کہا جائے گا:) تم اور تمہاری بیویاں جنت میں داخل ہو جاؤ' تم خوش کیے جاؤ گے۔ ان پر سونے کی رکابیاں اور پیالے گردش میں لائے جائیں گے' اور ان (رکابیوں اور پیالوں) میں وہ ہوگا کہ جو ان کے جی چاہیں گے اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگی' اور تم ان جنتوں میں ہمیشہ رہو گے۔ اور یہ وہ جنت ہے کہ جس کے تم وارث بنائے گئے ہو' اس کے بدلے میں کہ جو تم عمل کرتے تھے۔ تمہارے لیے اس میں کثرت سے پھل ہوں گے کہ جن میں سے تم کھاؤ گے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۱۵﴾ اٰخِذِیْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ﴾ (الذّٰریٰت:۱۶)

’’بے شک متقین باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ اور جو ان کو ان کا رب دے رہا ہوگا وہ اسے لے رہیں ہوں گے۔‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَعِیْمٍ ﴿۱۷﴾ فٰكِهِیْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ﴿۱۸﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ مُتَّكِـِٕیْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ ﴿۲۰﴾﴾ (الطور)

’’بے شک متقین باغات اور نعمتوں میں ہوں گے۔ ان کا رب انہیں جو دے رہا ہوگا وہ اس پر خوش ہو رہے ہوں گے۔ اور ان کا رب انہیں جہنم کے عذاب سے بچا لے گا۔ (اور ان سے کہا جائے گا کہ) تم کھاؤ اور پیو، جی بھر کر، اس کے بدلے میں کہ جو تم نیک عمل کرتے تھے۔ وہ بچھائے گئے تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے، اور ہم ان کے نکاح میں موٹی آنکھوں والی حوریں دیں گے۔‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴿۵۴﴾ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُّقْتَدِرٍ ﴿۵۵﴾﴾ (القمر)

’’بے شک متقین باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ باعزت مقام میں، اُس بادشاہ کے پاس، جو اقتدارِ مطلق والا ہے۔‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ ظِلٰلٍ وَّعُیُوْنٍ ﴿۴۱﴾ وَّفَوَاكِهَ مِمَّا یَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِیْٓـًٔۢا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۴۴﴾﴾ (المرسلٰت)

’’بے شک متقین سایوں اور چشموں میں ہوں گے۔ اور جو پھل وہ چاہیں گے، ملیں گے۔ (اور ان سے کہا جائے گا کہ) تم کھاؤ اور پیو، جی بھر کر، اس کے بدلے میں کہ جو تم نیک عمل کرتے تھے۔ ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ان لوگوں کو جو نیک اعمال کو عمدگی کے ساتھ کرتے ہیں۔‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اُكُلُهَا دَآىِٕمٌ وَّظِلُّهَا ؕ تِلْكَ عُقْبَى الَّذِیْنَ اتَّقَوْا ۖۗ وَّعُقْبَى الْكٰفِرِیْنَ النَّارُ ﴿۳۵﴾﴾ (الرعد)

’’اُس جنت کی مثال کہ جس کا وعدہ متقین سے کیا گیا ہے، ایسی ہے کہ اس کے دامن میں نہریں جاری ہیں، اس کے پھل اور سائے دائمی ہیں۔ یہ متقین کا انجام ہے، اور کافروں کا انجام آگ ہے۔‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِیْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ﴾ (محمد:۱۵)

’’اس جنت کی مثال کہ جس کا وعدہ متقین سے کیا گیا ہے، ایسی ہے کہ اس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو کبھی بدبودار نہ ہوگا، اور اس میں ایسے دودھ کی نہریں ہیں کہ جس کا ذائقہ تبدیل نہ ہوگا، اور اس میں ایسی شراب کی نہریں ہیں کہ جو پینے والوں کے لیے لذت بخش ہے، اور اس میں صاف ستھرے شہد کی نہریں ہیں، اور ان کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل اور اپنے رب کی مغفرت ہے۔‘‘

تقویٰ کے دینی ثمرات میں سے جنت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ انسان اللہ کا محبوب بن جاتا ہے، یعنی متقین وہ ہیں کہ جن سے اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں، اور جن سے اللہ محبت رکھے، ان کے مقام کے کیا کہنے! ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۷۶﴾﴾ (آل عمران)

’’کیوں نہیں، جس نے اپنے وعدے کو پورا کیا اور تقویٰ اختیار کیا تو اللہ عزوجل ایسے متقین سے محبت رکھتے ہیں۔‘‘

اہم بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں تین مقامات پر اس بات کا بیان ہے کہ اللہ عزوجل متقین سے محبت رکھتے ہیں اور ہر مقام پر یہ بیان ایفائے عہد کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَاَتِمُّوْٓا اِلَیْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۴﴾﴾ (التوبة)

''پس تم ان (یعنی وعدہ نہ توڑنے والے مشرکین) سے کیے جانے والے وعدوں کو ان کی مدت تک پورا کرو۔ بے شک اللہ عزوجل اہلِ تقویٰ سے محبت رکھتے ہیں۔''

ویسے تو اللہ کے ہر حکم میں تقویٰ کو ملحوظ رکھنا چاہیے لیکن قرآن مجید کی نص سے اشارتاً معلوم ہو رہا ہے کہ جو لوگ اپنے عہد (commitment) کو پورا کرنے میں اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں اور ہر حال میں وعدہ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہی صفت انہیں اللہ کا محبوب بنا دیتی ہے۔ یہی مضمون سورۃ التوبہ کی آیت ۷ میں بھی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں تقویٰ کے دینی ثمرات میں اللہ کی معیت کا بھی ذکر ہے یعنی متقین کو اللہ کا ساتھ نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے انسان اکیلے کوئی کام کرتے ہوئے گھبراہٹ یا وحشت محسوس کرتا ہے' تنہائی بعض اوقات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے اور اگر اسے کوئی اچھا ساتھی اور دوست میسر آ جائے تو اس کی گھبراہٹ یا وحشت جاتی رہتی ہے۔ تو متقین وہ ہیں کہ جنہیں ہر لمحے اللہ کے ساتھ ہونے کی نعمت میسر رہتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾﴾ (البقرۃ)

''جو (مشرک) تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو لیکن اتنی کہ جتنی اس نے تم پر زیادتی کی۔ اور اللہ سے ڈر جاؤ' اور جان لو کہ اللہ عزوجل متقین کے ساتھ ہے۔''

قرآن مجید میں اللہ عزوجل کے متقین کے ساتھ ہونے کا بیان بھی تین مقامات پر ہے اور تینوں مقامات پر یہ بیان کفار اور مشرکین کے ساتھ لڑائی کے بعد ہے۔ لڑائی میں انسان کو ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور بندۂ مؤمن کی لڑائی بھی کسی سے نہیں ہوتی سوائے ان کافر اور مشرکین کے کہ جو مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور لڑائی میں پہل کرتے ہیں' لہٰذا ایسے ظالموں کے مقابلے میں اللہ عزوجل اپنے نیک بندوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ سورۃ التوبہ کی آیت ۳۶ اور ۱۲۳ میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

متّقین کی صفات

قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر متقین کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ اس لیے کہ معلوم ہو کہ جس نے سلوکِ قرآنی میں متقین کے مقام کو پہنچنا ہے تو اسے کن مراحل سے گزر کر یہ مقام حاصل ہوگا۔ قرآن مجید کے سلوک اور تربیتی نظام میں مقامِ تقویٰ ہی ابتدائی اور انتہائی مقام

ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے کہ جو اللہ عزوجل کی طرف بڑھنے کا پہلا قدم بھی ہے اور آخری بھی۔ پس جس حال میں ایک سالک اللہ کے قرب کی منازل طے کرتا ہے' وہ تقویٰ کا حال ہے۔ سالک جس لمحے اس حال میں نہیں ہوتا' اس لمحے میں اللہ عزوجل کی طرف اس کا سفر رک جاتا ہے۔

قرآن مجید میں متقین کا مقام بیان کرنے کے بعد ان کی صفات کے بارے میں اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

﴿وَسَارِعُوْۤا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْۤا اَنْفُسَهُمْ ذَکَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۪ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۪ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَهُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۱۳۶﴾﴾ (آل عمران)

''اور تم اپنے پروردگار کی مغفرت اور اس جنت کی طرف دوڑو' جس کی چوڑائی زمین اور آسمانوں جتنی ہے جو کہ متقین کے لیے تیار کی گئی ہے۔ وہ متقین جو کہ خرچ کرتے ہیں' تنگی میں بھی اور خوشحالی میں بھی' اور غصے کو پی جانے والے' اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ اور اللہ عزوجل ایسے عمدہ عمل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ اور متقین وہ ہیں کہ جن سے اگر کوئی بے حیائی کا کام ہو جائے یا وہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں' اور اللہ کے علاوہ کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے؟ اور وہ اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے جبکہ وہ جانتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور ایسے باغات ہیں کہ جن کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی' ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اور عمل کرنے والوں کا اجر کیا ہی خوب ہے!''

مذکورہ بالا آیات میں متقین کی چار صفات بیان ہوئی ہیں کہ جن میں یہ چار صفات ہوں تو قرآنِ مجید کے بیان کے مطابق نہ صرف وہ متقی ہیں بلکہ جنت کے وارث بھی ہیں۔ ان میں سے پہلی صفت تو اللہ عزوجل کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ متقین وہ ہیں جو اللہ کے راستے میں ہر

حال میں خرچ کرتے رہتے ہیں‘ خوشحالی میں بھی اور تنگی میں بھی۔ ہمارے ہاں عام طور یہ غلط فہمی ہے کہ خرچ کرنے کا حکم اُمراء کو ہے‘ حالانکہ خرچ کرنے کا حکم امیر اور غریب دونوں کو ہے‘ البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ امیر اپنی استطاعت کے مطابق صدقہ کرے اور غریب اپنی استطاعت کے مطابق۔ جس کو ایک لاکھ کی استطاعت ہے‘ وہ ایک لاکھ کرے اور جسے ایک ہزار کی ہے‘ وہ ایک ہزار کرے اور جسے دس روپے کی ہے‘ وہ دس روپے کرے‘ لیکن کرے ضرور۔ قرآن مجید اصلاحِ نفس کا جو منہج تجویز کرتا ہے‘ اس میں خرچ کرنے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ انسان کے نفس میں موجود تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے اور دنیا کی محبت کا خلاصہ مال کی محبت ہے۔ انسان جب مال کی محبت پر اپنے پروردگار کی محبت کو ترجیح دے گا اور اُس کے راستے میں مال خرچ کرے گا‘ تو یہیں سے اُس کا تزکیہ شروع ہو جائے گا۔ تزکیہ دنیا اور مال کی محبت ختم کرنے کا نام نہیں ہے‘ وہ تو رہبانیت ہے کہ جو اسلام میں ممنوع ہے‘ بلکہ تزکیہ تو اللہ عزوجل کی محبت کو دنیا اور مال کی محبت پر غالب کرنے کا نام ہے۔

متقین کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ غصے کو پی جانے والے ہوتے ہیں۔ انتہائی غصے کی صورت میں بھی تحمل اور برداشت سے کام لیتے ہیں اور اس کا اظہار نہیں کرتے۔ جب انسان شدید غصے میں ہوتا ہے تو عموماً اس کے اظہار میں معتدل نہیں رہ پاتا۔ بعض اوقات شدید غصے کی حالت میں یا تو آواز بہت اونچی ہو جاتی ہے یا آواز کانپنا شروع ہو جاتی ہے یا انسان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے یا انسان اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے اور ان تمام حالات میں اس سے کسی معتدل رویے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا شدید غصے کو پی جانے سے مراد یہی ہے کہ اس حالت میں بالکل خاموش ہو جائے‘ ایک لفظ بھی نہ بولے۔

تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی پر شدید غصہ آئے اور انسان وقتی طور تو اسے دبا جائے لیکن اس شخص کو دل سے معاف نہ کرے تو اس سے انسان کے اندر ہی اندر اس شخص سے نفرت اور اس سے انتقام کی سوچ پروان چڑھتی رہے گی‘ جسے شیطان پھونکیں مار مار کر بڑھاتا رہے گا۔ اس طرح سے اپنا خون جلانے سے بہتر ہے کہ انسان اس شخص کو اس امید پر معاف کر دے کہ اللہ عزوجل اسے بھی معاف کرے گا یا اس کی کسی آزمائش کو دور کر دے گا یا اس کے درجات بلند کرے گا‘ وغیرہ۔ تو شدید غصے کو پی جانا اور اس کا اظہار نہ کرنا ایک صفت ہے جو معتدل رویے کے لیے ضروری ہے‘ اور دل

سے معاف کر دینا ایک دوسری صفت ہے جو انسان کی ذہنی صحت کے لیے ضروری ہے۔

چوتھی صفت یہ بیان فرمائی کہ اگر ان سے کوئی بے حیائی یا گناہ کا کام ہو جائے تو وہ فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ قرآن مجید میں متقی کا تصور یہ نہیں ہے کہ اس سے گناہ سرزد نہیں ہوگا۔ گناہ تو فرشتوں سے سرزد نہیں ہوتا یا انبیاء کرام سے نہیں ہو پاتا‘ ہم سب تو انسان ہیں کہ جو گناہ گار بھی ہیں۔ خود اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے: ((كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ))[1] ”تمام کی تمام اولادِ آدم بہت زیادہ گناہ کرنے والے ہیں‘ لیکن بہترین گناہگار وہی ہیں کہ جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہیں“۔ پس گناہ کا ہو جانا تقویٰ کے منافی نہیں ہے لیکن گناہ کر کے توبہ نہ کرنا تقویٰ کے منافی ہے۔ اگر کسی شخص کو گناہ کرنے کے بعد گناہ پر شرمندگی اور ندامت نہیں ہوتی اور گناہ پر اصرار کیے چلا جاتا ہے تو یہ متقی نہیں ہے‘ اور اگر کسی شخص کو گناہ کے ہوتے ہی ندامت اور شرمندگی کا احساس غالب ہو جائے اور وہ حالت استغفار میں چلا جائے تو یہ شخص متقی ہے۔ یہ اللہ عزوجل کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ہم سے گناہ ہی نہیں ہونا چاہیے‘ بلکہ یہ مطالبہ کیا ہے کہ گناہ کے فوراً بعد ہمیں توبہ کرنی چاہیے۔ گویا توبہ اور استغفار کے حال میں رہنا متقین کی صفات میں سے ایک اہم صفت ہے۔

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿١٧٧﴾﴾ (البقرة)

”نیکی یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف اپنے چہرے کر لو‘ بلکہ نیکی تو اس کی ہے کہ جو اللہ پر‘ آخرت کے دن پر‘ فرشتوں پر‘ کتابوں پر اور نبیوں پر ایمان لائے۔ اور مال کی محبت کے باوجود اسے اپنے رشتہ داروں‘ یتیموں‘ مسکینوں‘ مسافروں‘ سوال کرنے والوں اور غلاموں کے آزاد کروانے میں خرچ کرے۔ اور نماز قائم کرے اور

(۱) سنن ابن ماجه‘ كتاب الزهد‘ باب ذكر التوبة‘ ۲/۱۴۲۰

زکوٰۃ ادا کرے۔ اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے جبکہ وہ وعدہ کریں' اور تنگ دستی میں اور بیماری میں اور جنگ کے حالات میں صبر کرنے والے' یہی لوگ ہیں کہ جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کہ تقویٰ والے ہیں۔''

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ﴿۱۵﴾ اٰخِذِیۡنَ مَاۤ اٰتٰىہُمۡ رَبُّہُمۡ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا قَبۡلَ ذٰلِکَ مُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۶﴾ کَانُوۡا قَلِیۡلًا مِّنَ الَّیۡلِ مَا یَہۡجَعُوۡنَ ﴿۱۷﴾ وَ بِالۡاَسۡحَارِ ہُمۡ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ ﴿۱۸﴾ وَ فِیۡۤ اَمۡوَالِہِمۡ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَ الۡمَحۡرُوۡمِ ﴿۱۹﴾﴾ (الذّٰریٰت)

''بے شک متقین باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ اور جو ان کو ان کا رب دے رہا ہوگا تو وہ اسے لے رہیں ہوں گے کہ وہ اس سے پہلے نیک اعمال کو خوبصورتی سے کرنے والے تھے۔ اور وہ رات میں کم ہی سونے والے تھے۔ اور وہ سحری کے وقت میں استغفار کرنے والوں میں سے تھے۔ اور ان کے مال میں سوال کرنے والوں اور محروم لوگوں کا حصہ تھا۔''

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَلۡاَخِلَّآءُ یَوۡمَئِذٍۭ بَعۡضُہُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الۡمُتَّقِیۡنَ ﴿۶۷﴾ یٰعِبَادِ لَا خَوۡفٌ عَلَیۡکُمُ الۡیَوۡمَ وَ لَاۤ اَنۡتُمۡ تَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۸﴾ اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا بِاٰیٰتِنَا وَ کَانُوۡا مُسۡلِمِیۡنَ ﴿۶۹﴾﴾ (الزخرف)

''قیامت والے دن قریب ترین دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے۔ اے میرے (متقی) بندو! آج کے دن تم پر نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی تم غمگین ہوگے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور فرمانبردار رہے۔''

ان آیاتِ مبارکہ میں ایک تو یہ بات کہی گئی ہے کہ جنت والے دن تمام رشتے ناطے ایک دوسرے سے دور بھاگیں گے' لیکن جو تعلق اور رشتہ تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہوگا تو وہ قیامت والے دن میں بھی ایک دوسرے کے نہ صرف قریب ہوں گے بلکہ ایک دوسرے کے حق میں سفارش کریں گے۔ پس اگر دوستی کی بنیاد اللہ کا ڈر اور خوف ہوگا تو ایسی دوستی قیامت والے دن بھی قائم رہے گی۔ اور دوسری بات یہ بیان کی کہ متقین وہ ہیں کہ جو قرآن مجید کی آیات پر ایمان رکھتے ہوں اور فرمانبرداری کی زندگی گزارتے ہوں۔ ایمان کے ساتھ ایک اور وصف جمع ہو

جائے تو انسان متقی بن جاتا ہے اور وہ فرمانبرداری کی زندگی ہے کہ انسان اللہ کا فرمانبردار بن کر زندگی گزارے۔ فرمانبرداری سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے ہر حکم کو حتی المقدور پورا کرنے کی کوشش کرے' چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ پس جب انسان کی زندگی اس حال میں گزرے کہ وہ ہر لمحے میں اللہ کے کسی نہ کسی حکم کو پورا کر رہا ہو تو اس کو فرمانبرداری کی زندگی کہتے ہیں۔ اور پھر اگلی آیات میں ان متقین کو جنت کا وارث کہا گیا ہے۔

یہاں پھر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ باطنی امراض کے علاج کے لیے تجویز کردہ بعض وقتی طریقوں کو مستقل اور متوازن نظامِ دین کی حیثیت دے دی گئی اور غیر قرآنی اور غیر مسنون اصطلاحات کو تقدس دے کر ایک پورا نظامِ تربیت بنا کھڑا کیا گیا۔ چنانچہ قطب' ابدال اور قلندر وغیرہ ایسے انفرادی وکشفی کیفیات کو بعض عجمی تصورات پر منطبق کر کے انہیں جنت کا اصل وارث و موروث بنا دیا گیا۔ ان اصطلاحات کا تذکرہ تک قرآن مجید یا احادیث نبویہ میں نہیں ملتا۔ اور جن اصطلاحات اور مقاماتِ سلوک سے قرآن مجید اور احادیثِ نبویہ بھرے پڑے ہیں' ان کا تذکرہ ہمیں اس پورے نظام میں نہیں ملتا۔ مثلاً ''عباد الرحمٰن'' کا تذکرہ مروّجہ تصوف کی کس کتاب میں ہے یا کس سلسلے میں قرآن مجید کے بیان کردہ اس مقامِ سلوک کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے یا ہے؟ اس لیے ہم اپنی اس تحریر میں بار بار یہ توجہ دلا رہے ہیں کہ ہمیں اصلاحِ نفس کے جس پروگرام اور تربیت کے جس نظام کی ضرورت ہے' وہ جب تک قرآنی بنیادوں پر قائم نہ ہوگا' اس وقت تک معاشرے میں حقیقی تبدیلی نہیں آئے گی۔ مروّجہ تصوف کے مصنوعی نظامِ تربیت میں آپ کو قطبِ عالم تو بہت مل جائیں گے کہ جنہیں شاید کشفِ قبور بھی ہوتا ہو' وہ عالمِ برزخ کی سیر بھی کرا تے ہوں' وہ قلب بھی جاری کر دیتے ہوں' لیکن دوسری طرف شدید غصے کی کیفیت میں وہ آپے سے باہر ہو جاتے ہوں۔ وہ اپنے آپ کو قطبِ عالم کہلوانے پر عجیب خوشی محسوس کرتے ہوں' دل ان کے تکبر سے بھرے ہوں اور مصنوعی عاجزی کا اظہار کرتے نہ تھکتے ہوں' وہ اپنے مریدوں کو نیکی اور تقویٰ میں اپنے سے کمتر اور حقیر سمجھتے ہوں' ایسے قطب صاحب سے وہ اَن پڑھ دیہاتی بھلا ہے کہ جو اللہ عزوجل سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے معاملے میں ڈرنے والا ہے' وغیر ذلک کثیر' بھلے اسے اپنا لکھا ہوا نام بھی پڑھنا نہ آتا ہو۔ لیکن یہی وہ متقین ہیں کہ جنہیں اللہ عزوجل نے اپنے اولیاء قرار دیا ہے۔ تصوف کی پیدا کی ہوئی سب سے بڑی غلط فہمی یہی ہے کہ انہوں نے اولیاء اللہ کا قرآنی تصور غوث' قطب' ابدال'

اور قلندر جیسی غیر قرآنی اصطلاحات کے راستے مسخ کر دیا ہے کہ جن کے حصول کے لیے آپ کو مراقبہ کرنا ہے‘ پاس انفاس میں وقت گزارنا ہے‘ سماع سے حال طاری کرنا ہے‘ وجد میں آنا ہے‘ قلب کو جاری کرنا ہے‘ کشف قبور کی مشق کرنی ہے اور اسی طرح کے اور بہت سے اعمال سیکھنے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝۶۲ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ۝۶۳ ﴾ (یونس)

’’خبردار! بلاشبہ اولیاء اللہ پر نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے۔‘‘

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر قرآن مجید کے مقاماتِ سلوک کو بیان کر دیا جائے تو آج کل کے اکثر و بیشتر پیرانِ طریقت اور مصنوعی اقطابِ عالم سے زیادہ نیک ان کے مرید دکھائی دیں کہ قلندری کے جتنے راستے‘ مجاہدے اور صفات ہیں‘ وہ سب کے سب ایک فن ہیں‘ جس کا حاصل یہ ہے کہ کس طرح اپنے آپ کو دوسروں سے برتر ثابت کرنا ہے اور دوسروں کو اپنے نیچے لگانا ہے۔

قرآنی سلوک کے مطابق اپنی تربیت کرنے والا کبھی اس درجہ بندی میں مبتلا نہیں ہوگا کہ جو تصوف کے مروّجہ مصنوعی حلقوں میں نظر آتی ہے کہ کوئی پہلے آسمان پر ہے تو کوئی ساتویں آسمان پر ہے‘ بلکہ یہاں سب اللہ کے بندے ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں۔ رہنمائی کرنے والا بھی اتنا ہی اللہ کی رحمت کا محتاج ہے‘ جتنا کہ رہنمائی لینے والا کہ دونوں انسان ہیں۔ دنیا میں بہت سے تزکیہ کرنے والوں کو قیامت کے دن معلوم ہوگا کہ انہیں اپنے بعض مریدوں سے تزکیہ کروانے کی ضرورت تھی۔ اب تو عجب تماشہ ہے کہ ایک جعلی پیر کے مرید دوسرے پیر کے مریدوں کی بیعت تڑواتے ہیں تاکہ ان کے حلقۂ ارادت میں اضافہ ہو۔ پیروں کی توجہ مریدوں کی تربیت سے زیادہ ان کی تعداد بڑھانے پر ہے‘ چند مرید کرنے کی خاطر بیرون ملک تک سفر کیے جاتے ہیں۔ بعض مرید اپنے پیروں کے فضائل میں تقابل ایسے کرتے ہیں جیسا کہ تجارتی کمپنیاں اپنی پراڈکٹس کی تشہیر کرتی ہیں (العیاذ باللہ!)۔ جبکہ سلوکِ قرآنی میں غیر معصوم سالکین ایک دوسرے کی صحبت سے برابر استفادہ کرتے ہیں‘ کچھ تھوڑا اور کچھ زیادہ‘ چھوٹا بڑے سے سیکھتا ہے اور بڑا چھوٹے سے‘ شاگرد اپنے استاذ سے سیکھتا ہے اور کبھی استاذ اپنے

شاگرد سے‘ جیسا کہ سورۃ العصر میں ہے:

﴿ وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝۳ ﴾ (العصر)

’’قسم ہے زمانے کی‘ بلاشبہ سب انسان خسارے میں ہیں‘ مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت کی اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔‘‘

تقویٰ کا حصول

اس سلسلے کی آخری بحث یہ ہے کہ تقویٰ جب سلوکِ قرآنی کا ابتدائی اور انتہائی مقام ہے تو اس کے پیدا کرنے اور حاصل کرنے کے ذرائع اور وسائل کیا ہیں؟ قرآنِ مجید نے تقویٰ کی دو قسموں کو بیان کیا ہے: ایک وہ جو انسان میں پیدائشی طور موجود ہے اور دوسری وہ جسے انسان محنت اور مجاہدے سے حاصل کرتا ہے۔ تقویٰ کی جو صورت انسان میں پیدائشی طور موجود ہے‘ وہ اس کا وہ شعور ہے جو اسے خیر اور شر میں تمیز عطا کرتا ہے۔ ہر انسان میں اللہ عزوجل نے ایک ترازو قائم کر دیا ہے جو اچھے اور برے میں تمیز قائم کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا ۝۷ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا ۝۸ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝۹ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝۱۰ ﴾ (الشمس)

’’اور قسم ہے نفس کی اور اس کو سنوارنے کی۔ پس اللہ عزوجل نے ہر نفس میں اس کا فسق و فجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا ہے۔ پس جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا تو اس نے فلاح پائی‘ اور جس نے اسے مٹی میں دبا دیا تو وہ نامراد ہو گیا۔‘‘

ہر انسان میں ضمیر کی ایک عدالت قائم ہے جو اسے بتلاتی ہے کہ تم نے جھوٹ بول کر‘ وعدہ خلافی کر کے‘ دھوکا دے کر‘ ظلم کر کے اچھا نہیں کیا۔ اب بعض انسان تو ضمیر کی آواز کو سن لیتے ہیں اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں تو یہی نفس کے تزکیے کا عمل ہے۔ اور بعض انسان ضمیر کی اس آواز کو اپنے اندر ہی دبا دیتے ہیں اور بعض تو ضمیر ہی کو سلا دیتے ہیں تو یہ اپنے نفس کو مٹی میں دبانے کے مترادف ہے۔

تقویٰ کی دوسری صورت جو کہ کسبی ہے‘ وہ بعض اعمال کے اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور بعض اعمال سے بڑھ جاتی ہے۔ جن اعمال سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے‘ ان میں سے ایک

عمل ہدایت کے راستے کو اختیار کرنا اور اس پر چلنے کے لیے مجاہدہ کرنا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰىهُمْ تَقْوٰىهُمْ ﴿۱۷﴾﴾ (محمد)

’’اور جن لوگوں نے ہدایت کے راستے کو اختیار کیا‘ اللہ عزوجل انہیں ہدایت میں بڑھا دیتے ہیں اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا کرتے ہیں۔‘‘

اسی طرح قرآن مجید کی آیات‘ خاص طور پر وعید والی آیات کہ جن میں اللہ عزوجل کی طرف سے اپنے بندوں کو ڈرایا گیا ہے‘ میں غور وفکر بھی تقویٰ کے حصول کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾﴾ (البقرۃ)

’’اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات کو لوگوں کے لیے کھول کھول کر بیان کرتے ہیں تا کہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔‘‘

ایک اور مقام پر اسی بارے میں ارشاد ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾﴾ (طٰہٰ)

’’اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر نازل کیا اور اس میں ڈراوے کو طرح طرح سے بیان کیا تا کہ وہ متقی بن جائیں یا ان کے لیے نصیحت پیدا ہو۔‘‘

ایک اور مقام پر روزے کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے تقویٰ حاصل ہو۔ پس روزہ بھی تقویٰ حاصل کرنے کے ذرائع میں ایک اہم ذریعہ ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾﴾ (البقرۃ)

’’اے اہلِ ایمان! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم متقی بن جاؤ۔‘‘

بلکہ عبادت کی کوئی بھی صورت ہو‘ اس پر عمل انسان میں تقویٰ پیدا کرتا ہے‘ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾﴾ (البقرۃ)

’’اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تم کو پیدا کیا اور ان کو بھی جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔‘‘

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کی تعظیم بھی ان امور میں شامل ہے کہ جن سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۳﴾﴾ (الحجرات)

’’بے شک جو لوگ اللہ کے رسول (ﷺ) کے پاس اپنی آوازوں کو دبا کر رکھتے ہیں تو یہ وہی لوگ ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ عزوجل نے تقویٰ کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔‘‘

ضرورت اس امر کی ہے کہ جس طرح ہم نے تقویٰ کے مقام کو قرآن مجید سے تفصیل سے واضح کیا ہے‘ اسی طرح قرآن مجید کے دیگر مقاماتِ سلوک کو بھی تفصیل سے بیان کیا جائے تا کہ سلوکِ قرآنی کے مطابق لوگ اپنی شخصیت کی تعمیر اور نفس کی اصلاح کر سکیں۔ اور یہی وہ شخصیت کی تعمیر اور نفس کی اصلاح ہے کہ جس پر آخرت میں انعام و اکرام اور کامیابی کی بشارتیں بھی دنیا میں ہی اللہ کی کتاب میں دے دی گئی ہیں۔

❁❁❁

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 100 روپے، اشاعت عام 60 روپے

قرآنِ کریم کی اُصولی باتیں (۱۳)

پروفیسر ڈاکٹر عمر بن عبداللہ المقبل

ترجمہ: ابوعبدالرحمٰن شبیر بن نور

۳۹واں اصول:

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ۝ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ۝﴾

’’پس جب تم فارغ ہو تو عبادت میں محنت کرو‘ اور اپنے پروردگار کی طرف دل لگاؤ۔‘‘

یہ قرآنی اصول جامع المعانی ہے‘ روح کی تربیت کے اُصولوں میں سے یہ ایک اُصول ہے۔ اور روح کو اللہ کی طرف متوجہ کرنے والا اُصول ہے‘ جسے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الانشراح میں بیان کیا ہے۔ اس سورت میں خطاب کا رخ نبی اکرم ﷺ کی طرف ہے۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی بہت ساری نعمتیں ذکر کی ہیں اور سورت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ جب تم کسی نیکی سے یا کسی ایک کام سے فارغ ہو جاؤ تو دوسرے کام کی طرف متوجہ ہو جاؤ یا کوئی دوسری نیکی شروع کر دو‘ اور یہ کہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہو جاؤ‘ دعا کرنے میں‘ عبادت میں‘ التجا کرنے اور عاجزی کا اظہار کرنے میں۔ اس لیے کہ سچے مسلمان کی ساری زندگی ہی اللہ تعالیٰ کے لیے ہوتی ہے‘ اس میں فضول کاموں کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ جس تفریح کی شریعت نے اجازت دی ہے وہ تو عورتوں اور بچوں کے لیے ہے یا پھر عید‘ شادی بیاہ یا کسی اور خوشی کے موقع کی مناسبت سے ہے۔ ایسی تفریح کا عظیم مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی طاقت وہمت کو تازہ کر لے اور دوسرے مفید کام کے لیے تیاری پکڑ لے اور اپنے ہر حال میں اللہ کا بندہ بن کر رہے۔ خوشی ہو یا پریشانی‘ سختی ہو یا آسانی‘ حالتِ قیام ہو یا سفر‘ ہنسنا ہو یا رونا‘ ہر حال میں اطاعت و غلامی اُس میں نظر آئے‘ تاکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول اُس پر سچ ثابت ہو:

﴿قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾﴾ (الانعام)

’’(اے نبی ﷺ!) آپ فرما دیجیے کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادات‘ میرا زندگی گزارنے کا طریقہ اور مرنے کا طریقہ اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے۔‘‘

جس مفہوم کو یہ اصول: ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿۷﴾ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ﴿۸﴾﴾ (الانشراح) ’’پس جب تم فارغ ہو تو عبادت میں محنت کرو‘ اور اپنے پروردگار کی طرف دل لگاؤ‘‘ بیان کر رہا ہے‘ وہ بہت عظیم المعنیٰ ہے۔ یہ ان چند بنیادی اصولوں میں سے ایک ہے جو یہ کہہ رہا ہے کہ اسلام اپنے اُن ماننے والوں کو ناپسند کرتا ہے جو ہر طرح کے کام سے فارغ ہوں‘ نہ اُنہیں دنیاوی کام ہو اور نہ ہی وہ آخرت کا کام کریں۔

سیدنا عبداللہ بن مسعود ؓ فرماتے ہیں: ’’مجھے سخت ناپسند ہے کہ میں کسی آدمی کو بالکل فارغ دیکھوں‘ اُسے نہ دنیا کا کوئی کام ہو اور نہ آخرت کا‘‘۔ اس لیے کہ کوئی آدمی بالکل فارغ ہو یا ایسے کام میں مشغول جس کا دنیا یا آخرت میں کوئی فائدہ نہ ہو‘ یہ سوچ کی حماقت‘ عقل کی کمزوری اور ہڈحرامی کی دلیل ہے۔ قرآنِ کریم کے اس محکم اصول: ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿۷﴾ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ﴿۸﴾﴾ (الانشراح) ’’پس جب تم فارغ ہو تو عبادت میں محنت کرو‘ اور اپنے پروردگار کی طرف دل لگاؤ‘‘ سے یہ راہنمائی ملتی ہے کہ جس قدر ہو سکے مؤمن اپنے کاموں کو جلدی جلدی سمیٹ لے اور فرصت کے انتظار میں انہیں نہ ٹالے۔ اس قسم کا بہانہ بنا کر بہت سارے لوگ اپنے آپ کو دھوکہ دیتے رہتے ہیں اور اسے اپنی ناکامی کی دلیل بناتے ہیں۔ جو شخص آج کے دن کو استعمال کرنے سے عاجز ہے‘ وہ آنے والے دن کو استعمال کرنے میں آج سے زیادہ عاجز ہوگا۔

ایک نیک آدمی نے کہا: ’’سلف صالحین تو اس بات سے بھی اللہ تعالیٰ کا حیا کرتے تھے کہ اُن کا آج کا دن بھی سابقہ کل والے دن کے برابر رہے‘ اس لیے کہ وہ ہر روز نیک عمل میں اضافہ چاہتے تھے‘ اگر ایسا نہ ہوتا تو اُنہیں شرم آتی اور اُسے خسارہ سمجھتے۔‘‘

﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ ﴿۷﴾ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارْغَبْ ﴿۸﴾﴾ (الانشراح) ’’پس جب تم فارغ ہو تو عبادت میں محنت کرو‘ اور اپنے پروردگار کی طرف دل لگاؤ‘‘۔ اس اصول کو چھوڑنے

کا نتیجہ اس وقت سمجھ آتا ہے جب کسی کو علم حاصل کرنے کا موقع تو ملا‘ لیکن اس نے عمر بھر فائدہ نہ اٹھایا اور زندگی بیت گئی‘ اَب اُسے ندامت ہو رہی ہے کہ اُس نے ایسا علم حاصل نہیں کیا جس کا اُسے زندگی میں یا مرنے کے بعد فائدہ ہو سکے۔

اسی طرح کی کوتاہی توبہ کرنے‘ اللہ کی طرف توجہ کرنے یا رغبت کرنے کے حوالے سے بہت سارے لوگوں میں پائی جاتی ہے‘ بالخصوص نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس کا زیادہ ہی شکار ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ جب بوڑھے ہو جائیں گے تو توبہ کر لیں گے۔ اللہ کی قسم! یہ شیطان کی طرف سے بہت بڑا دھوکا ہے۔ شیطان کے اس وسوسے سے جان چھڑانے اور اس سے دور رہنے کے لیے جس چیز سے ہم اللہ کی مدد لے سکتے ہیں وہ یہی اصول ہے جس پر بات ہو رہی ہے: ﴿فَاِذَا فَرَغۡتَ فَانۡصَبۡ ﴿۷﴾ وَاِلٰی رَبِّکَ فَارۡغَبۡ ﴿۸﴾﴾ ’’پس جب تم فارغ ہو تو عبادت میں محنت کرو‘ اور اپنے پروردگار کی طرف دل لگاؤ۔‘‘

۴۰واں اصول:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ﴾

’’بلاشبہ اللہ عدل کا حکم دیتا ہے۔‘‘

یہ قرآنی اصول ہے اور جامع المعانی کلمہ ہے‘ اور یہ تمام آسمانی شریعتوں کا سب سے عظیم اصول ہے‘ جس سے کوئی چیز خارج نہیں‘ اور اس اصول کے تحت بے شمار فروعی مسائل آتے ہیں‘ جن کو اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی شمار نہیں کر سکتا۔ اور اس اصول پر تمام آسمانی شریعتیں متفق ہیں۔ بعض علماء کا قول ہے: ’’عدل کی اچھائی پر تمام الہامی شریعتیں اور تمام اہلِ حکمت متفق ہیں۔ تمام امتوں کے راہنماؤں نے عدل قائم کرنے کی بھرپور تعریف کی ہے۔ اور ان کے تعریف بھرے کلمات کو کلدہ (عرب علاقوں میں پھیلی ہوئی شہنشاہت) مصر اور ہند کی بڑی بڑی عمارتوں پر نقش کیا گیا تھا۔

اس قرآنی محکم اصول: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ﴾ (النحل: ۹۰) ’’بلاشبہ اللہ عدل کا حکم دیتا ہے‘‘ کی روشنی میں ہماری ساری گفتگو اس عظیم شرعی مقصد یعنی عدل کے ارد گرد گھوم رہی ہے۔ اسی عدل کو تمام شریف اور فطرتِ سلیمہ والے لوگ پسند کرتے ہیں۔ عدل قائم کرنے سے بہت سارے فائدے اور خوبیاں حاصل ہوتی ہیں۔ نظامِ عدل قائم کرنے سے کتنے ہی لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب ملی ہے۔ اس ضمن میں ایک واقعہ آپ حضرات کے

سامنے پیش کر رہا ہوں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ دوستوں سے پہلے دشمنوں کے دل میں اس نے اپنے اثرات نقش کر دیے ہیں۔

امام ابن عساکرؒ نے اپنی کتاب ’’تاریخ دمشق‘‘ میں امام الشعبی رحمہ اللہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ: ’’سیدنا علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ نے اپنی زرہ ایک عیسائی کے پاس دیکھی‘ چنانچہ اُسے لے کر قاضیٔ وقت جناب شریح کے پاس پہنچ گئے‘ تاکہ اپنا دعویٰ پیش کر سکیں۔ راوی بیان کرتا ہے کہ جب سیدنا علیؓ تشریف لائے تو قاضی شُریح کے پہلو میں بیٹھ گئے اور قاضی سے مخاطب ہو کر فرمایا: ’’اے شریح! اگر میرا مخالف مسلمان ہوتا تو میں اس کے ساتھ ہی بیٹھتا‘ لیکن وہ عیسائی ہے‘ جبکہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((اذا کنتم وایاھم فی طریق فاضطروھم الٰی مضایقۃ وصغروا بھم کما صغر اللّٰہ تعالٰی بھم من غیر ان تطغوا))

’’جب تم اور وہ (غیر مسلم) ایک ہی راستے پر ہوں تو انہیں تنگ راستے کی طرف دھکیل دو‘ اور جیسے اللہ تعالیٰ نے انہیں چھوٹا بنایا ہے تم بھی انہیں چھوٹا ہی بنا کر رکھو‘ البتہ اُن پر زیادتی نہ کرو۔‘‘

اس کے بعد سیدنا علیؓ نے فرمایا: ’’یہ زرہ میری زرہ ہے‘ میں نے نہ تو اِسے بیچا ہے اور نہ ہی اِسے تحفہ میں دی ہے‘‘۔ جناب شُریح نے عیسائی سے دریافت کیا: ’’جو کچھ امیر المؤمنین کہہ رہے ہیں تمہارا اس بارے میں کیا جواب ہے؟‘‘ عیسائی نے کہا: ’’یہ زرہ تو میری ہی ہے‘ اور میں امیر المؤمنین کو جھوٹا بھی نہیں کہہ سکتا‘‘۔ اب قاضی شُریح‘ سیدنا علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے‘ پوچھا: ’’اے امیر المؤمنین! کوئی گواہ ہے؟‘‘ سیدنا علیؓ مسکرا دیے اور فرمایا: ’’شریح نے کھری بات کی ہے‘ میرے پاس کوئی گواہ نہیں‘‘۔ چنانچہ قاضی شریح نے عیسائی کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ نصرانی چند قدم جا کر واپس آ گیا اور کہنے لگا: ’’میں گواہی دیتا ہوں کہ انبیاءؑ کے انصاف کا طریقہ بھی یہی تھا۔ امیر المؤمنین مجھے قاضی کے سامنے پیش کرتا ہے اور اس کا اپنا قاضی اس کے خلاف فیصلہ کرتا ہے!‘‘ پھر نصرانی کلمہ طیبہ ’’لا الٰہ الا اللہ محمدٌ رسول اللہ‘‘ پڑھ کر مسلمان ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: ’’اے امیر المؤمنین! واللہ! زرہ آپ ہی کی ہے۔ ہوا یوں کہ آپ صفین کے لیے جا رہے تھے اور میں لشکر کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا‘ آپ کے اونٹ سے یہ زرہ گر گئی تھی‘‘۔ سیدنا علیؓ نے فرمایا: ’’چونکہ تم مسلمان ہو گئے ہو لہٰذا یہ زرہ تمہاری ہوئی‘ اور آپ نے اس نئے مسلمان کو اونٹ پر سوار بھی کروایا‘‘۔ امام شعبیؒ بیان کرتے ہیں: مجھے اس آدمی نے بتایا جس

نے دیکھا تھا کہ یہی نیا مسلمان (جو پہلے عیسائی تھا) سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کے ساتھ مل کر جنگ میں شریک تھا۔

ذرا غور کریں کہ اس وقت کی اسلامی حکومت کے سربراہ کے کردار نے کیسے اثرات پیدا کیے‘ بلکہ وہی آدمی آپ کے لشکر کا حصہ بن کر خوارج کے خلاف جنگ میں شریک ہوا۔ اس قسم کے مواقع پر عادلانہ فیصلہ کرنے کا اس سے زیادہ اور کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟ یہی نہیں‘ بلکہ عادل امام کے لیے یہ بھی خوشخبری ہے کہ قیامت کے روز اُسے عرشِ الٰہی کے سائے سے نوازا جائے گا‘ جب کہ اس دن اس سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔

اس واقعے میں ایک اور قابل غور بات بھی ہے‘ کہ اگر قاضی کو یہ یقین نہ ہو کہ اسے پوری پشت پناہی ملے گی اور اس قسم کا فیصلہ صادر کرنے میں حاکمِ وقت‘ حکومت و معاشرہ اس کا دست و بازو بن جائے گا تو وہ حاکم وقت کے خلاف فیصلہ کرنے کا کبھی سوچ نہیں سکتا۔ اور جب قاضی اپنی رائے میں عدل کے مطابق فیصلہ نہ کرسکے تو ایسی قضاء پر دور سے سلام۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ ’’بلاشبہ اللہ عدل کا حکم دیتا ہے‘‘ کے سائے پھیل کر سارے معاشرے کو ٹھنڈی چھاؤں مہیا کرتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

۱- بیویوں کے درمیان عدل کرنا: خاندانی زندگی میں یہ حکم بہت تاکید سے بیان ہوا ہے۔ اس میں مزید تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں‘ بس اس چیز کی ضرورت ہے کہ زیادہ بیویوں والوں کو اس بات کی یاددہانی کروائی جائے کہ وہ بیویوں کے درمیان عدل کرنے کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہیں‘ مرنے سے پہلے اس زندگی میں ہی عدل کے خلاف چلنے کے نتائج سے ڈرتے رہیں۔ مختلف ماؤں کی اولاد میں جو جھگڑے کھڑے ہوتے ہیں‘ وہ انتہائی خطرناک معاملہ ہے۔ لوگوں میں جو جگ ہنسائی ہوتی ہے‘ وہ الگ معاملہ ہے۔ آخرت میں جو حساب ہوگا وہ تو اور بھی زیادہ بڑا اور سخت ہوگا۔ ایسے حضرات کو اللہ کے رسول ﷺ کی سیرتِ طیبہ پر غور کرنا چاہیے کہ آپؐ نے نو بیویوں کے ساتھ زندگی گزاری۔ عبرت اور سبق حاصل کرنے کے لیے یہی کافی ہوگا۔

۲- اولاد کے درمیان انصاف کرنا: والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اولاد کے درمیان عدل کریں‘ اور کسی کو کسی دوسرے پر فضیلت نہ دیں‘ چاہے یہ معنوی باتوں کا معاملہ ہو‘ جیسے محبت‘ شفقت اور توجہ وغیرہ‘ یا مادّی چیزوں کا معاملہ ہو‘ جیسے ہدیے‘ تحفے وغیرہ۔

۳- بات کہنے اور دوسروں کے بارے میں شہادت دینے میں عدل وانصاف کرنا:

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ۚ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ۝۱۳۵﴾ (النساء)

’’اے ایمان والو! عدل وانصاف پر مضبوطی سے جم جانے والے اور اللہ کی خوشنودی کے لیے سچی گواہی دینے والے بن جاؤ‘ خواہ وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہو یا اپنے ماں باپ کے یا رشتہ دار عزیزوں کے۔ چاہے وہ شخص امیر ہو یا فقیر‘ دونوں کے ساتھ اللہ کو زیادہ تعلق ہے۔ اس لیے تم خواہش نفس کے پیچھے پڑ کر انصاف نہ چھوڑ دینا۔ اور اگر تم نے کج بیانی یا پہلوتہی کی تو جان لو کہ جو کچھ تم کرو گے اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔‘‘

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا﴾ (الانعام:۱۵۲)

’’اور جب تم بات کرو تو عدل کی کرو۔‘‘

یہ بہت بڑا میدان ہے۔ اس میں افراد‘ جماعتیں‘ فرقے‘ کتابیں اور مقالات پر رائے دینا‘ سب شامل ہو جاتے ہیں۔

۴- خرچ کرنے میں عدل کرنا (اعتدال سے خرچ کرنا): اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تَجْعَلْ یَدَکَ مَغْلُوْلَۃً اِلٰی عُنُقِکَ وَلَا تَبْسُطْھَا کُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ۝۲۹﴾ (الاسراء)

’’اپنا ہاتھ اپنی گردن سے بندھا ہوا نہ رکھ اور نہ اُسے بالکل ہی کھول دے‘ کہ پھر ملامت کیا ہوا اور درماندہ بیٹھ جائے۔‘‘

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَکَانَ بَیْنَ ذٰلِکَ قَوَامًا ۝۶۷﴾ (الفرقان)

’’اور وہ لوگ جو خرچ کرتے وقت بھی نہ تو اسراف کرتے ہیں نہ بخیلی‘ بلکہ ان دونوں

کے درمیان معتدل طریقے پر خرچ کرتے ہیں۔‘‘

نبی اکرم ﷺ کی عظیم ترین دعاؤں میں سے ایک دعا یہ تھی: ((وَأَسْأَلُكَ الْقَصْدَ فِي الْفَقْرِ وَالْغِنٰى)) ’’اور میں غریبی اور امیری میں میانہ روی کا طلبگار رہوں۔‘‘

خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اللہ تعالیٰ کے احکامات پر غور کرے گا وہ انہیں افراط وتفریط جیسے مذموم اخلاق کے درمیان درمیان پائے گا۔ قرآنِ کریم کے اِس اُصول کے یہی معنی ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ ’’بلاشبہ اللہ عدل کا حکم دیتا ہے۔‘‘

۴۱واں اصول:

﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿٣٠﴾﴾ (الشوریٰ)

’’اور تمہیں جو کوئی مصیبت بھی پہنچتی ہے وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی کے سبب آتی ہے‘ اور وہ بہت سی باتوں سے تو درگزر فرما دیتا ہے۔‘‘

یہ محکم قرآنی اصول ہے۔ جو شخص اس پر غور کرے اور اسے سمجھ بھی آ جائے تو اس کے حق میں اس کے اندر ایمانی اور تربیتی تاثیر موجود ہے۔ یہ محکم قرآنی اصول ملتے جلتے الفاظ کے ساتھ بار بار بیان ہوا ہے اور اس میں پائے جانے والے معانی بھی کئی جگہ بیان ہوئے ہیں‘ جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿١٦٥﴾﴾ (آل عمران)

’’(کیا بات ہے) کہ جب تمہیں ایسی تکلیف پہنچی کہ تم اس جیسی دو چند پہنچا چکے تھے تو کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آ گئی؟ آپ کہہ دیجیے کہ یہ خود تمہاری طرف سے ہے‘ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔‘‘

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’نصوصِ قرآنی کو تلاش کرنے والے عالم کی رائے کے مطابق آیتِ کریمہ کے مفہوم کا خلاصہ یہ ہے: ’’قرآنِ کریم نے کئی جگہ یہ بات بیان کی ہے کہ کسی گناہ کے بغیر نہ تو اللہ تعالیٰ نے کسی کو ہلاک کیا ہے اور نہ ہی سزا دی ہے۔‘‘

جو بات ان آیاتِ کریمہ میں بیان ہوئی ہے بعینہٖ یہی بات سنتِ نبویؐ میں بھی بیان

ہوئی ہے۔ سیدنا ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے حدیثِ قدسی بیان کرتے ہوئے فرمایا:

((اِنَّمَا هِيَ أَعْمَالُكُمْ أُحْصِيهَا لَكُمْ ثُمَّ أُوَفِّيكُمْ اِيَّاهَا، فَمَنْ وَجَدَ خَيْرًا فَلْيَحْمَدِ اللّٰهَ، وَمَنْ وَجَدَ غَيْرَ ذٰلِكَ فَلَا يَلُوْمَنَّ اِلَّا نَفْسَهُ))

(صحیح مسلم/۲۵۷۷)

’’یہ تو تمہارے اپنے ہی اعمال ہیں‘ میں انہیں گن گن کر رکھ رہا ہوں‘ پھر میں انہیں پورا پورا تمہیں لوٹا دوں گا۔ پھر جس آدمی کو اچھا نتیجہ ملے وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور جس کو مختلف نتیجہ ملے وہ صرف اپنے آپ ہی کو ملامت کرے۔‘‘

نیز سیدنا شداد بن اوس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سید الاستغفار میں تم یوں کہو:

((اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَاَنَا عَبْدُكَ وَاَنَا عَلٰى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، اَبُوْءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ وَاَبُوْءُ لَكَ بِذَنْبِيْ، فَاغْفِرْ لِيْ فَاِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ))

(صحیح البخاری/ ۸۳۴ وصحیح مسلم/ ۲۷۰۵)

’’اے اللہ! تو ہی میرا رب ہے‘ تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں‘ تو نے مجھے پیدا کیا اور میں تیرا بندہ ہوں۔ میں اپنی استطاعت کے مطابق تیرے عہد اور وعدے پر قائم ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا ہے اُس کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں‘ میرے اوپر تیری طرف سے جو بھی نعمت ہے اس کا بھی اعتراف کرتا ہوں اور میں اپنے گناہ کا بھی اعتراف کرتا ہوں‘ لہٰذا تو مجھے معاف فرما دے‘ کیونکہ تیرے علاوہ کوئی اور گناہ کو معاف نہیں کر سکتا۔‘‘

جب سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے ایسی دعا سکھلانے کا کہا جو وہ نماز میں پڑھ سکیں تو آپ ﷺ نے فرمایا: تم یہ دعا پڑھا کرو:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ ظُلْمًا كَثِيْرًا وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ، فَاغْفِرْ لِيْ مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ))

(صحیح البخاری/ ۸۳۴ وصحیح مسلم/۲۷۰۵)

’’اے اللہ! میں نے اپنی جان پر بہت زیادہ ظلم کیے ہیں اور تیرے علاوہ کوئی گناہ معاف نہیں کر سکتا‘ چنانچہ اپنی طرف سے مجھے معافی دے دے اور مجھ پر رحم فرما‘ یقیناً

تیری ذات ہی غفورٌ رحیم ہے۔‘‘

اس حدیث پر اچھی طرح غور فرمائیں! سوال کرنے والا کون ہے؟ جواب دینے والا کون ہے؟ سوال کرنے والے سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں‘ جو صدیق اکبر ہیں‘ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد مواقع پر آپ کو جنت کی خوشخبری سنائی ہے۔ جواب دینے والے خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو سب سے زیادہ خیر خواہ اور مشفق ہیں۔ اس سب کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کہہ رہے ہیں کہ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں اور بہت زیادہ ظلموں کا اعتراف کریں‘ اور اپنے رب سے مغفرت اور درگزر کی دعا کریں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد کون ہوسکتا ہے جسے اِس دعا کی ضرورت نہ ہوگی؟

جب یہ شرعی حقیقت بالکل واضح ہوگئی کہ گناہ ہی سزا کا سبب ہوا کرتے ہیں خواہ یہ سزا ذاتی ہو یا اجتماعی‘ تو عقل مند کو چاہیے کہ اپنے آپ سے شروع کرے اور جہاں جہاں غلطی ہو رہی ہو اُسے تلاش کرے اور اللہ تعالیٰ سے ہدایت کی دعا کرتا رہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو گناہ پر گناہ اور غلطی پر غلطی کیے جاتے ہیں اور بالکل توجہ نہیں کرتے‘ بلکہ انہیں ان گناہوں کی پرواہ ہی نہیں ہوتی۔ اللہ کی پناہ! ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ان گناہوں کو بھی اچھا ہی سمجھتے ہوں۔ ایسی صورت حال میں اُن پر بار بار آفتیں آتی ہیں اور اُن کو اس بات کا شعور بھی نہیں ہوتا۔ ایسی صورتِ حال میں اُن کی مشکل بھی کئی گنا ہوتی ہے۔

امام ابن القیم رحمہ اللہ اس محکم قرآنی اصول کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

’’دنیا وآخرت میں جو بھی مشکل یا پریشانی ہے‘ اُس کا سبب گناہ ومعاصی کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے؟

ہمارے والدین (آدم وحوا علیہما السلام) کو لذت ونعمت بھری نیز خوشی وسرور والی جنت سے نکال کر تکلیفوں‘ پریشانیوں اور مصیبتوں والے گھر میں کس عمل نے پہنچایا؟

اور کس جرم نے شیطان کو آسمان کی بادشاہت سے نکال باہر کیا؟ اس کو بھگا دیا‘ اس پر لعنت ہوگئی‘ اس کے ظاہر وباطن کا حلیہ بگڑ گیا‘ اس کی شکل وصورت کو مکروہ ترین شکل بنا دیا اور اس کے باطن کو ظاہر سے بھی زیادہ مکروہ بنا دیا؟

پوری کی پوری قومِ نوح کو کس جرم نے غرق کیا؟ حتیٰ کہ پانی پہاڑ کی چوٹی سے بھی اونچا ہوگیا۔

کس جرم نے قومِ عاد پر ملیا میٹ کر دینے والی تیز وتند آندھی کو مسلّط کیا کہ وہ زمین پر اس طرح گرے ہوئے تھے جیسے کہ کھجوروں کے تنے گرے ہوتے ہیں؟

اور کس جرم نے قومِ ثمود پر دہشت ناک آواز بھیجی‘ حتیٰ کہ ان کے دل اندر ہی پاش پاش ہوگئے اور ان کا آخری فرد بھی ختم ہوگیا؟

اور کس جرم نے قومِ لوط کی بستی کو آسمانوں تک اُٹھایا حتیٰ کہ فرشتوں نے اُن کے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی‘ اور اس کو اوپر سے اس طرح پھینک دیا کہ ساری بستی الٹی ہوگئی۔ اس طرح ان سب کو ہلاک کر دیا‘ پھر آسمان سے اُن کے اُوپر پتھروں کی بارش کر دی اور اُن کو اس قسم کی سزا دی کہ ان سے پہلے اور ان کے بعد کسی قوم کو ایسی سزا نہیں دی گئی۔ اور اُن کے بھائیوں کو بھی اسی قسم کی سزا ملی۔ اور ان لوگوں کی بستیاں ظالموں سے کچھ زیادہ دور نہیں ہیں۔

اور کس جرم نے فرعون اور اس کی قوم کو سمندر میں غرق کیا؟ پھر اُن کی روحوں کو جہنم میں ڈال دیا گیا‘ جسموں کا انجام غرق ہونا تھا اور روحوں کا انجام آگ میں جلنا۔

اور کس جرم میں قارون‘ اس کا گھر‘ اس کا مال‘ اور اس کے گھر والے زمین میں دھنس گئے؟

اور کس جرم میں قومِ نوح کے بعد کئی قومیں متعدد سزاؤں سے دوچار ہوئیں اور انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا؟...... الخ‘‘ (امام ابن قیم کی بات مکمل ہوئی۔)

اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جب ظاہری یا اجتماعی سزاؤں کا ذکر ہوتا ہے تو انہی کو مکمل سزا نہیں سمجھ لینا چاہیے‘ جن کی طرف امام ابن القیمؒ نے اشارہ کیا ہے‘ جیسے تباہی وبربادی‘ غرق ہونا‘ تیز آواز‘ جیل ہونا اور دوسری جسمانی سزائیں۔ بلاشبہ یہ بھی سزائیں ہی ہیں لیکن کچھ سزائیں اِن سے بڑھ کر اور زیادہ سخت ہوتی ہیں‘ اور یہ وہ سزائیں ہیں جو دلوں پر مسلط کی جاتی ہیں‘ چنانچہ دل غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں اور سخت ہو جاتے ہیں‘ چاہے اُن کی آنکھوں کے سامنے دنیا بھر کے پہاڑ ٹکرا جائیں پھر بھی وہ عبرت نہیں حاصل کرتے‘ اور نہ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ اللہ کی شریعت سے دوری کے باوجود جس شخص یا قوم کو نعمتیں فراوانی سے مل رہی ہوں اور بڑھتی ہی چلی جا رہی ہوں وہ فرد یا قوم سمجھ بیٹھتی ہے کہ یہ تو اللہ کی رضا کی نشانی ہے۔ ذاتِ الٰہی کی قسم! یہ بہت بڑی سزا ہے‘ جس میں بندہ گرفتار ہو جاتا ہے یا کوئی قوم اس میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ہم اللہ کی ناراضگی اور غضب کے اسباب سے اسی ذات کی پناہ میں آتے ہیں۔

(جاری ہے)

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

(۱۹۳۲ء۔۲۰۱۰ء)

ازقلم: مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی

مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی ﷾ ہندوستان کی معروف علمی شخصیت ہیں۔ وہ صاحبِ طرز ادیب اور درجنوں کتابوں کے مصنف ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب ’’نقوشِ خاطر‘‘ (جلد اول) شائع ہوئی ہے‘ جو قلمی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب میں برعظیم پاک و ہند کے ۴۹ مشاہیر علماء‘ علمی و ادبی اور روحانی شخصیات کے مختصر حالات درج ہیں‘ جن میں مولانا اشرف علی تھانوی‘ مولانا شبیر احمد عثمانی‘ سید سلیمان ندوی اور قاری محمد طیب ﷭ جیسے مشاہیر علماء کے تذکرے موجود ہیں۔ کتاب میں داعی رجوع الی القرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا تذکرہ بھی شامل ہے‘ جو ہدیۂ قارئین کیا جارہا ہے۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا ‘ تلقینِ غزالی نہ رہی!

لحیم شحیم جسم‘ مائل بہ دراز سڈول قامت جو پاکستانی ہونے کی علامت‘ گندمی رنگ‘ چوڑی پیشانی پر علم و فضل کا آفتاب جلوہ فگن‘ باوقار چہرہ‘ ادھ پکی گنجان و مسجع داڑھی‘ بڑی بڑی متفکر آنکھیں‘ ان آنکھوں میں اسلامی تحریکات و انقلابات کی داستانِ کہن‘ پٹھے دار بال‘ سر پر سیاہ بالوں والی قراقلی یا جناح کیپ۔ عالمانہ طرز کی تراشی ہوئی لبیں‘ لمبا کرتا‘ پنجابی کٹ کی سفید شلوار‘ نفیس کپڑے کی موزوں شیروانی‘ علم و عمل کا بحرِ زخار‘ شریعت و طریقت کا سنگم‘ علامہ اقبال کے سوز و ساز کا وارث‘ رزمِ حق و باطل ہے تو فولاد ہے مومن کا مصداق‘ ایسی تلوار جس میں کاٹنے کی زبردست قدرت مگر موقع و محل کے استعمال سے واقف‘ تقلید سے دور‘ حلم و بردباری کا مجسمہ‘ تکلفات و تصنعات سے ناآشنا‘ روشن دماغ‘ حاضر جواب‘ مردم شناس و معاملہ فہم‘ اگر

کوئی آرٹسٹ و فنکار‘ ان قلمی خطوط و نقوش میں رنگ بھرے تو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہریانوی ثم لاہوری کا حسین مجسمہ تیار ہو جائے گا۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب پاکستان ہی کے نہیں بلکہ عالمِ اسلام کے مشہور مفسرِ قرآن اور نامور مفکر تھے۔ آپ کی انقلاب آفریں طبیعت ہر وقت اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے بے تاب رہتی تھی اور مصائب و آلام سے کبھی نہیں گھبراتی۔ آپ مسلسل ذہنی کشمکشوں و دماغی الجھنوں‘ شب و روز کے تلخ و شیریں تجربوں‘ کامیابی و ناکامیابی کی کشاکشوں‘ فکر و خیال کے انقلابوں اور علم و نظر کے مشاہدوں کی بھٹی میں تپتے رہتے تھے اور آپ اس طرح فکری سوز و تپش میں اپنے سیاہ بالوں کو نہایت تیزی سے سفید کرتے جارہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب جدید و قدیم کے ایک ایسے سنگم بنے ہوئے تھے‘ جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے بھرپور انداز میں آکر مل گئے تھے۔

آپ سراپا جدید و قدیم کا مجسمہ تھے۔ آپ ماضی کی پاکیزہ روایات سے بھی اپنے رشتے و ناطے استوار کیے ہوئے تھے اور جدید و قدیم کی حسین آمیزش سے آپ کی عالم گیر و آفاقی شخصیت بنی تھی اور اب آسمانِ سیادت و قیادت پر نیر تاباں بن کر چمک دمک رہے تھے۔

ڈاکٹر صاحب ایک انتہائی کامیاب ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے۔ آپ کو پریکٹس چھوڑے ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ آپ کی تعلیم و تربیت مغربی طرز پر ہوئی تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں؟ آپ مغربی طرزِ زندگی سے بیزار ہو کر مولویانہ‘ درویشانہ‘ صوفیانہ اور مجاہدانہ زندگی پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ماضی و حال کو دیکھ کر منکرِ تقدیر بھی مقدرات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہوگا۔ ڈاکٹر صاحب چونکہ انگریزی کالجوں اور عصری یونیورسٹیوں کے بھیدی اور مغربی تہذیبوں کے راز داں تھے اس لیے آپ کو یہ اشعار پڑھنے اور لکھنے کا حق و جواز ہے ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں اُلجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیے

ڈاکٹر صاحب ایک روشن خیال اور روشن ضمیر مفسرِ قرآن تھے۔ آپ ایک خاص طرزِ تفسیر کے موجد و بانی تھے۔ البتہ آپ کی تفسیر زیادہ تر ولی اللّٰہی تحریک کے قائدین کی تفسیری تحقیقات و

نظریات کی روشنی میں ہوتی ہے‘ لیکن بعض تفسیری نکات اور نادر تحقیقات آپ کی قرآنی روح سے وابستگی کا نتیجہ ہیں۔ راقم الحروف کو ڈاکٹر صاحب کی مسلسل تقریریں سننے اور آپ کے مشہور مجلّات ’’میثاق‘‘ اور ’’حکمت قرآن‘‘ کے متعدد شمارے دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا۔

راقم الحروف بلاخوفِ تردید اپنی محدود معلومات کی روشنی میں کہہ سکتا ہے کہ آپ بعض ایسی تفسیری تحقیقات بیان فرماتے تھے کہ جن سے قدیم وجدید تفاسیر خالی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض تفسیری خیالات سے اتفاق کرنا مشکل ہے‘ لیکن ان کی نیک نیتی‘ علمی دیانتداری اور پروازِ ذہنی وبلند خیالی کا تسلیم نہ کرنا اسرار ناشناسی کے مترادف ہے۔

ڈاکٹر صاحب کاروباری قسم کے مفسر قرآن نہیں تھے۔ آپ کے باشعور ذہن اور بیدار دماغ میں کچھ ’’انقلابی خاکے‘‘ اور کچھ ’’تعمیری منصوبے‘‘ تھے‘ جن کی تکمیل کے لیے آپ ہمہ وقت سیماب کی طرح بےقرار رہتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی دعوت رجوع الی القرآن کی تحریک بہت پرانی ہے۔ ہندوستان میں دعوت رجوع الی القرآن کی تحریک کے بانی اعظم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہیں۔ اور ولی اللّٰہی قرآنی تحریک انقلاب کے اولین رہنماؤں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اسیر مالٹا‘ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبیداللہ سندھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب ولی اللّٰہی تحریک کے آخری اور عظیم مجاہد تھے جو ولی اللّٰہی تحریک کو عملی شکل دینے اور آخری نقطۂ عروج پر پہنچانے کے لیے غیر معمولی جدوجہد کر رہے تھے‘ حتیٰ کہ اپنے پیشہ طب کو بھی قربان کر چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریک جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں‘ دانشوروں اور باشعور علماء میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب پاکستان کے مشہور خطیب اور بلند پایہ انقلابی مقرر تھے۔ آپ کا اندازِ خطابت بڑا دلکش ودل آویز تھا۔ آپ کا ہر جملہ ادبی شہ پارہ ہوتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب بولتے رہیں اور ان کے منہ سے جو پھول جھڑیں ہم چنتے رہیں۔ آپ علم وفضل کے بحرِ زخار تھے۔ آپ کے مزاج میں بڑا تنوع تھا۔ آپ ہر موضوع پر‘ خواہ دینی ہو یا سیاسی‘ بڑی دلکش اور روح پرور تقریر کرتے تھے۔ لیکن جب آپ اپنے خاص موضوع جہاد بالقرآن یا فریضۂ اقامتِ دین یا سیرت النبی ﷺ پر ولولہ انگیز تقریر کرتے تھے تو لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں اور جذبات پر قابو پانا مشکل ہو جاتا تھا۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا گویا معرکہ کارزار میں خالد بن ولید اور ابوعبیدہ بن الجراح ؓ مجاہدین اسلام کو للکار رہے ہیں۔ چند سال پہلے

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہندوستان تشریف لائے تھے۔ آپ نے دہلی میں متعدد بڑے بڑے مجمعوں سے خطاب فرمایا۔ راقم الحروف نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کی اثر انگیز ودلآویز تقریر سن کر بے شمار سامعین بے تحاشا رو پڑتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب صاحبِ طرز ادیب اور نامور صحافی تھے۔ آپ کے مقالات ومضامین میں خطیبانہ زورِ استدلال اور عالمانہ قوتِ بیان ہوتی ہے۔ آپ کی زبان نہایت شستہ وشگفتہ تھی۔ آپ کی تحریروں کو پڑھنے اور تقریروں کو سننے کے بعد یہ فیصلہ کرنا مطلقاً مشکل نہیں رہتا کہ آپ شاعرِ مشرق‘ علامہ اقبال مرحوم سے بہت ہی متاثر تھے۔ آپ جگہ جگہ پر اپنے افکار و نظریات کی تائید میں علامہ مرحوم کے اشعار پیش کرتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو عربی و فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار اس طرح نوکِ زبان پر رہتے تھے گویا یہ قطار در قطار دست بستہ کھڑے تھے اور آپ کے اشارہ پاتے ہی تقریر وتحریر کے حضور میں حاضر ہو جاتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے سراپا کو دیکھ کر بڑے بڑے قیافہ شناس بھی رائے زنی اور قیاس آرائی میں خطا کر جاتے تھے اور یہ گمان کرنے لگتے تھے کہ آپ کوئی اصطلاحی مولانا ومولوی تھے‘ حالانکہ آپ جسمانی روگ کے اسپیشلسٹ ڈاکٹر تھے‘ لیکن اب لاعلاج روحانی مریضوں کے حکیم حاذق بنے ہوئے تھے۔ بقول مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب‘ ڈاکٹر صاحب کو نہ عالم ہونے کا دعویٰ تھا اور نہ فقیہہ ومتکلم اور نہ شیخ طریقت ہونے کا ادّعا تھا۔ ڈاکٹر صاحب تو خود شہرت سے بے نیاز ہو کر انتہائی خلوص اور سوز وتڑپ کے ساتھ دعوت الی القرآن کی تحریک میں مشغول رہتے اور آپ کو نہ صلے کی تمنا تھی اور نہ ستائش کی پروا‘ بلکہ ﴿وَمَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ کی عملی تفسیر تھے۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پاکستان کے احوال وکوائف خصوصاً سیاسی حالات کی نبض پر بھی رہتے تھے اور اس میدان میں بھی آپ کو اللہ کی طرف سے خصوصی بصیرت عطا ہوئی تھی۔ آپ کے سیاسی خیالات ونظریات نہایت متوازن اور معقول ہوتے تھے۔ آپ نے ہمیشہ جانب داری اور افراط وتفریط سے اجتناب کیا۔

ڈاکٹر صاحب کو پاکستانی اربابِ اقتدار سے بنیادی اور اصولی اختلاف رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ قائدین پاکستان نے تقسیم ملک کے لیے یہ نعرہ دیا تھا کہ ’’پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الٰہ الا اللہ!‘‘ پاکستان دراصل اسی اسلامی تصور پر معرضِ وجود میں آیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب

اسی ''میثاقِ الست'' کی یاد دہانی فرماتے تھے' تو ہر آنے والی حکومت چراغ پا ہو جاتی۔ حالانکہ ڈاکٹر صاحب میدانِ انتخاب کے پہلوان اور عملی سیاست کے اکھاڑے باز نہیں بلکہ ساحل سمندر پر بیٹھ کر سمندر کی سیاسی طغیانیوں کا نظارہ کرنے والے مردِ حق آگاہ تھے۔ بقول شخصے' تکوینی والہامی اشارات کرتے رہتے تھے۔

راقم الحروف نے ڈاکٹر صاحب کو پہلی دفعہ غالباً ۸۴۔۱۹۸۳ء میں جامعہ رحیمیہ مہندیان میں دیکھا۔ مولانا اخلاق حسین قاسمی نے رسمی تعارف کرایا۔ ڈاکٹر صاحب غیر معمولی اندازِ محبت کے ساتھ پیش آئے۔ دوسری دفعہ لاہور میں ان کی قرآن اکیڈمی میں ملاقات نصیب ہوئی' بڑی شفقت ومحبت سے پیش آئے' حالانکہ رمضان المبارک میں بے پناہ مصروف رہتے تھے۔ مسلسل کئی روز تک لاہور میں ملاقاتیں رہیں۔ تیسری دفعہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب جب ہندوستان آئے تو آپ کے ہمراہ آپ کے فرزندار جمند اور راقم الحروف کے صدیق حمیم حافظ عاکف سعید (ایم اے) بھی دہلی تشریف لائے تھے۔ ہم لوگ دہلی کے تاریخی مقامات دیکھنے کے علاوہ آگرہ بھی گئے تھے۔

حافظ عاکف سعید صاحب نے ہندوستان سے واپسی کے بعد ''ہندوستان میں پندرہ دن'' کے عنوان سے میثاق میں سفر نامہ لکھا۔ موصوف نے راقم الحروف کو جگہ جگہ پر گھسیٹا ہے۔ بعض جگہ یہ محسوس ہوا کہ خاکسار کا نام نہ بھی آتا تو سفر نامہ میں کوئی خاص زلزلہ نہیں آتا' لیکن عاکف سعید صاحب نے دوست نوازی کا ثبوت دیا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔

آخر میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہندوستان آئے' اس دفعہ قیو ٹی وی (Qtv) کی وجہ سے آپ کی بڑی شہرت ہو چکی تھی' جگہ جگہ آپ کے پروگرام ہوتے تھے' میں بھی آپ کے بعض پروگراموں میں شریک رہا' بڑی مقبولیت تھی۔

مجھے بھی اپنے انتقال سے چند ماہ قبل ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے پاکستان آنے کی دعوت دی تھی' میں ان کی دعوت پر لاہور گیا' ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے فرمایا: مولانا عطاء الرحمٰن قاسمی کتنے دنوں کے لیے پاکستان آئے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ پندرہ دنوں کے لیے آیا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے کہ پانچ روز اپنے دوست عاکف سعید کی خاطر اور پانچ روز میری خاطر یعنی ۲۵ روز لاہور میں قیام کریں گے۔ میں مسکرانے لگا۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب کی شفقت قابلِ دید تھی۔

دو تین روز کے بعد ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ مولانا عطاء الرحمٰن صاحب لاہور میں کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا کہ ایک جامع مسجد لاہور اور دوسرے شورش کاشمیری کے اخبار چٹان کے دفتر کو دیکھنا چاہتا ہوں جو مولانا آزاد کے بڑے قدر دان تھے۔ تیسرے محمد اسحٰق بھٹی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں' چوتھے علامہ اقبال کے صاحبزادے جسٹس جاوید اقبال سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ جامع مسجد لاہور ضرور دیکھئے' چٹان کا دفتر ختم ہو گیا ہے۔ اسحٰق بھٹی صاحب سے ملاقات ضرور کر لیں۔ اور جہاں تک جاوید اقبال سے ملاقات کا معاملہ ہے تو وہ بدقسمتی سے اینٹی اسلام اور اینٹی اقبال ہیں۔ ان سے مل کر آپ کو رنج ہی ہوگا۔

ان دنوں ڈاکٹر صاحب کا معمول تھا کہ صبح ۱۰ بجے مجھے اپنے دفتر میں بلا لیتے تھے اور مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے' اور ہندوستان اور پاکستان کی صورتحال پر گفتگو کرتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب پاکستان کی صورتحال سے بڑی تشویش میں مبتلا تھے' وہ کہتے تھے: جو صورت حال ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پاکستان کا وجود ہی خطرہ میں ہے۔ ہندوستان ایک مضبوط اور پر امن جمہوری ملک ہے' یہاں علمی ودعوتی کام کرنے کے زیادہ امکانات ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو میں نے اُن دنوں ایک عجیب کیفیت میں مبتلا دیکھا' جب میں ان کے کمرے میں جاتا تھا تو انہیں سر جھکائے ہوئے کسی مسئلہ میں سوچتے ہوئے پاتا اور جب میں سلام کرتا تو چونک جاتے اور سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے قریب بٹھا لیتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کافی ضعیف ہو چکے تھے' مگر تفسیر قرآن سے ان کا تعلق برقرار تھا۔ وہ کہتے تھے کہ مجھے پاکستان میں ''قرآن کا قوال'' کہا جاتا ہے۔

جب میں چلنے لگا تو بڑے اعزاز واکرام کے ساتھ رخصت کیا اور شیروانی کا قیمتی کپڑا عنایت فرمایا۔

راقم الحروف نے ان دنوں ڈاکٹر صاحب کو بہت قریب سے دیکھا' پرکھا اور ان کی بلند ظرفی' وسیع قلبی' معاملہ فہمی' خورد نوازی اور دینداری' نیک نیتی جیسے اوصافِ کریمہ سے بے پناہ متاثر ہوا —— لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ شام زندگی تھی' جو غروب ہو رہی تھی۔

❁❁❁

صبر کے مفہوم کی وسعت اور اس کا صلہ

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ نظامِ کائنات میں اس کی مشیت کارفرما ہے۔ دکھ سکھ اسی کی طرف سے ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَنَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَةً ؕ﴾ (الانبیاء:۳۵) ''ہم تو تم لوگوں کو سختی اور آسودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں''۔ انسان پر جو بھی حالت طاری ہوتی ہے' خواہ وہ خوشی کی ہو یا غمی کی' وہ صبر کی متقاضی ہے۔ صبر کا معنی ہے رکنا' ضبط کرنا۔ اگر انسان پر خوشی کے لمحات آتے ہیں تو انہیں صبر سے گزارنا ہے' اس موقع پر اخلاقی اور شرعی حدود سے تجاوز کرنا بے صبری ہے۔ غمی کے موقع پر غم میں نڈھال ہو کر واویلا کرنا' شکوہ وشکایت کرنا' صبر کے منافی ہے۔ صحت مند آدمی ان کاموں سے بچ کر رہے جن سے صحت مندی کی ناشکری ظاہر ہو۔ اس کے اندر یہ جذبہ موجود رہے کہ صحت اس سے چھن بھی سکتی ہے' اگر ایسا ہوا تو پھر کیا ہوگا۔ اسی طرح بیماری میں صبر کرنا یہ ہے کہ بیماری کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سمجھے اور جانے کہ اس میں بھلائی ہے۔ غرض ہر طرح کے حالات میں ضبط کا مظاہرہ کرے' یہ بہت بڑے ثواب کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کا باعث۔

صبر کرنا مشکل ضرور مگر اجر کے اعتبار سے بہت اعلیٰ ہے۔ قرآن اور حدیث میں صابرین کے لیے بڑے درجے ہیں۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَاصۡبِرُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيۡنَ ۚ﴾ (الانفال) ''صبر کرو' بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔'' ﴿وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيۡنَ﴾ (آلِ عمران) ''اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔'' یہ وہ رتبہ ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی اعزاز نہیں۔ عام طور پر بیماری' غربت وافلاس اور صدمات کو ناخوشگوار سمجھا جاتا ہے' مگر ان کی ناخوشگواری اس وقت دور ہو جاتی ہے جب ان حالات کو اللہ کی مشیت جانا جائے' اور صبر کا دامن نہ چھوٹنے پائے' تو اجر وثواب کا وعدہ ہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی راست رو ہے جسے صحت' عزت' خوشحالی' نیک اولاد اور ہر طرح کی دنیاوی سہولیات ملی ہوئی ہوں اور وہ غرور و تکبر سے بچ کر ان کا اچھا استعمال کر رہا ہو۔ ان نعمتوں کو عطیۂ خداوندی سمجھ کر ان سے دوسروں

کو فائدہ پہنچائے۔ یہ شخص بھی صابرین میں شامل ہوگا اور بے حد وحساب اجر پائے گا۔ اگرچہ سازگار حالت میں بھی صبر کرنا احساسِ تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں' تاہم صبر کا اعلیٰ درجہ دکھوں' مصائب' صدمات اور بیماریوں میں صبر کرنا ہے۔ ان کو کمال حوصلے کے ساتھ برداشت کرنا اور جزع وفزع سے بچ کر رہنا' شکوہ وشکایت نہ کرنا' اور یہ سمجھنا کہ یہ اللہ کی طرف سے ہیں جو الرحمٰن اور الرحیم ہے' اس کا کوئی کام عبث اور حکمت سے خالی نہیں۔ وہ الحکیم ہے' اس کی ہر حکمت کو انسان کماحقہ نہیں سمجھ سکتا' کیونکہ انسان محدود صلاحیتوں کا مالک ہے: ﴿وَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡئًا وَّهُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ ۚ وَعَسٰۤى اَنۡ تُحِبُّوۡا شَيۡئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمۡ ؕ﴾ (البقرۃ:۲۱۶) ''ہوسکتا ہے کہ کوئی چیز تم کو بری لگے اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو' اور ہوسکتا ہے ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔''

عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ صبر کا تعلق صرف مصائب وآلام اور صدمات کے ساتھ ہے' حالانکہ خوشی کے مواقع بھی صبر کے ساتھ گزارنے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک گھرانے میں شادی کا موقع ہے۔ خوشی کے اس پر رونق موقع پر شرعی احکام کو پس پشت ڈال دینا صبر کے منافی ہے۔ یہ وقت تو اللہ کا شکر ادا کرنے کا ہے جس نے یہ خوشی دکھائی۔ اس گہما گہمی میں غیر شرعی رسومات کی پابندی کرنا اور نمازوں کو ضائع کر دینا بے صبری ہے۔ اسی طرح کا معاملہ خوشی کے دیگر مواقع پر کیا جاتا ہے' حالانکہ خوشی کے مواقع پر بھی صبر کا دامن ہاتھ سے جانے دینا' نہ صرف بے صبری ہے بلکہ ناشکری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو بھلا بیٹھے جس نے یہ خوشی دی ہے۔

اگر بندہ مصیبت کی حقیقت جان لے تو اس کو صبر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس مصیبت سے انقباض اور پریشانی بڑھے وہ تو گناہوں کی وجہ سے ہے اور جس سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہو اور تسلیم ورضا زیادہ ہو وہ حقیقتاً مصیبت نہیں' گو صورتاً مصیبت ہو۔ چنانچہ مصیبت میں صبر کرنا رفع درجات کا باعث ہوتا ہے۔ مصائب دراصل ایک تجارت ہے کہ ایک چیز ہم سے لی جاتی ہے اور اس کے عوض دوسری چیز دی جاتی ہے' یعنی سکون اور چین لیا جاتا ہے اور اُخروی انعام دیا جاتا ہے۔

قرآن مجید کے واضح الفاظ ہیں کہ: ﴿مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ﴾ (التغابن:۱۱) ''کوئی مصیبت اللہ کے حکم کے بغیر نہیں آتی۔'' چونکہ اسلام کامل ضابطۂ حیات ہے لہٰذا مصائب کو برداشت کرنا بھی سکھایا گیا ہے۔ اگر انسان کا عقیدہ پختہ ہو کہ جس طرح دنیوی نعمتیں صحت' دولت' خوشحالی اور اولاد اللہ کے عطیات ہیں اسی طرح صدمات' مفلسی اور

پریشانیاں بھی اسی کی طرف سے ہیں تو ناخوشگوار حالات میں صبر کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ نعمتوں پر شکر کرنا نعمتوں میں اضافے کا باعث ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ﴾ (ابراھیم:۷) ''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں لازماً اور زیادہ دوں گا۔'' اسی طرح نعمتوں کے چھن جانے یا مصیبت اور بیماری پر صبر کرنا عین صواب اور اجر کا باعث ہے۔ جبکہ جزع فزع اور رونے پیٹنے اور واویلا کرنے سے نقصان کی تلافی نہیں ہوتی بلکہ اجر ضائع ہو جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ کا کمسن بیٹا ابراہیم فوت ہو رہا تھا تو آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ لوگوں کے استفسار پر آپؐ نے واضح فرمایا کہ یہ آنسو شفقت اور دردمندی کے ہیں' افسوس کے نہیں۔ بیٹا فوت ہو گیا تو آپؐ نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور فرمایا: ''اے ابراہیم! تمہاری جدائی کا ہمیں صدمہ ہے''۔ (صحیحین) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے ایک بیٹے کا انتقال ہو گیا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو تعزیت نامہ لکھوایا:

''اللہ کے رسول محمد (ﷺ) کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام۔ سلامٌ علیک! میں پہلے تم سے اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں (بعد ازاں) دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ پر اجر عظیم دے' اور تمہارے دل کو صبر عطا فرمائے' اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے مال اور ہمارے اہل و عیال یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں اور اس کی سپرد کی ہوئی امانتیں ہیں (اس اصول کے مطابق تمہارا لڑکا بھی تمہارے پاس اللہ کی امانت تھا) اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور جب اس کی مشیت ہوئی اپنی اس امانت کو تم سے واپس لے لیا' وہ تم کو اس کا بڑا اجر دینے والا ہے' اللہ کی خاص نوازش اور اس کی رحمت اور اس کی طرف سے ہدایت (کی تم کو بشارت ہے) اگر تم نے ثواب اور رضائے الٰہی کی نیت سے صبر کیا --- پس اے معاذ! صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ جزع وفزع تمہارے قیمتی اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو (کہ صدمہ بھی پہنچا اور اجر سے بھی محرومی رہی) اور یقین رکھو کہ جزع فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے رنج و غم دور ہوتا ہے' اور اللہ کی طرف سے جو حکم اترتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے' بلکہ یقیناً ہو چکا ہے۔ والسلام!'' (رواہ الطبرانی فی الکبیر والاوسط)

نبی اکرم ﷺ نے صبر کا بڑا اجر بتایا اور مصیبت پر جزع فزع کرنے سے منع کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو کوئی (غمی اور موت کے موقع پر) اپنے رخساروں پر طمانچے مارے اور منہ پیٹے اور گریبان پھاڑے اور اہل جاہلیت کے طریقے پر واویلا کرے وہ ہم میں سے نہیں (یعنی وہ ہمارے طریقے پر نہیں ہے)''۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

ہر قسم کی نعمتیں اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے اور اولاد بھی وہی دیتا ہے۔ باقی نعمتوں کی طرح اولاد بھی ماں باپ کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ جب دوسری نعمتوں کی طرح اولاد کی نعمت چھن جاتی ہے تو طبعی محبت کی بنا پر اس موقع پر انسان بڑے صدمے سے دوچار ہوتا ہے اور غم کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلتے ہیں۔ اس صدمے کے وقت صبر کرنا اور یہ سمجھنا کہ بیٹا یا بیٹی اللہ کی امانت تھی' جس وقت اُس نے چاہا امانت واپس لے لی' یہ اس کی رضا ہے' یہی طرزِ عمل مطلوب ہے۔ جب بندہ اللہ کی رضا پر راضی ہو گیا تو اُس نے بہت زیادہ اجر پایا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ کے کسی بندے کا بچہ انتقال کر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ روح قبض کرنے والے فرشتے سے فرماتا ہے: تم نے میرے بندے کے بچے کی روح قبض کی؟ وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں! پھر فرماتا ہے کہ تم نے اس کے دل کا پھل اس سے لے لیا؟ وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں! پھر فرماتا ہے کہ اس بندہ نے اس حادثہ پر کیا کہا (اور اپنا کیا تاثر ظاہر کیا؟) فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اس بندے نے آپ کی حمد کی' آپ کا شکر کیا اور اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيۡهِ رَاجِعُوۡنَ پڑھا (یعنی ہم سب اللہ ہی کے لیے ہیں اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کے جانے والے ہیں) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ (اس کے اس صابرانہ رویہ پر) اس کے لیے جنت میں ایک عالیشان گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو۔ (مسند احمد' جامع ترمذی)

جب کسی کے ہاں کسی عزیز کی وفات ہو جائے تو تعزیت کے لیے آنے والے لوگ کہتے ہیں بہت افسوس ہے! بڑی بے وقت موت ہے! یہ کہنا صحیح نہیں ہے۔ موت دینا اللہ تعالیٰ کا کام ہے اور اللہ تعالیٰ کا کوئی کام عبث یا بے وقت نہیں ہوتا۔ وہ الحکیم ہے' اُس کا ہر کام اچھا اور بروقت ہے۔ اس کا موت و حیات کا نظام حکیمانہ ہے۔ تعزیت کے وقت ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيۡهِ رَاجِعُوۡنَ'' کہا جائے اور کہا جائے کہ اللہ کی مرضی اسی طرح تھی اور پسماندگان کو صبر کی تلقین کی جائے۔

دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ دکھ' تکالیف' مصائب اور صدمات تو بہر حال آئیں گے۔ یہ اللہ

تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ اس نے ان مصائب پر صبر کرنے والوں کو بڑے اجر کی خوشخبری سنائی ہے۔ اگر کوئی مصائب پر واویلا کرتا ہے‘ روتا پیٹتا ہے تو وہ مصیبت ٹل تو نہیں جاتی‘ بلکہ وہ دکھ زیادہ پریشان کرتا ہے‘ جبکہ مصیبت پر جزع فزع نہ کرنے اور صبر کرنے کا اعلیٰ صلہ اور ثواب موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ بیمار آدمی کے پاس جاتے تو اسے خوشخبری سناتے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ایمان والے بندے کے کسی پیارے کو جب میں اٹھا لوں پھر وہ ثواب کی امید میں صبر کرے تو میرے پاس اس کے لیے جنت کے سوا کوئی معاوضہ نہیں‘‘۔ (صحیح بخاری)

بیماریوں اور مصائب پر صبر کرنے کے اجر کی بشارت تو احادیث کی روشنی میں مسلّم ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’کسی مردِ مؤمن کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے‘ مرض سے یا اس کے علاوہ‘ تو اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جس طرح خزاں رسیدہ درخت اپنے پتے جھاڑ دیتا ہے۔‘‘ (بخاری و مسلم)

یہ بدلہ صبر کی بدولت ہے۔ حضرت ابوہریرہ ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں جب کسی کی دو پیاری چیزیں (یعنی آنکھیں) لے لیتا ہوں اور وہ اس پر صبر کرتا ہے اور ثواب کا امیدوار رہتا ہے تو میں اس کے لیے جنت سے کم ثواب پر راضی نہیں ہوتا‘‘۔ (ترمذی)

مصائب پر صبر کرنا بڑے اجر کا باعث ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی سینکڑوں دعائیں ہیں‘ مگر کسی دعا میں آپؐ نے بیماری یا مصیبت طلب نہیں کی کہ اس طرح برائیاں ختم ہوں گی اور نیکیاں ملیں گی‘ اور نہ اُمت کو ایسی دعا کرنے کی تعلیم دی ہے۔ حالانکہ یہ خوشخبری آپ ﷺ کی طرف سے بیماروں اور مصیبت زدہ لوگوں کو بار بار دی گئی ہے کہ اس سے گناہوں کی بخشش ہوتی ہے۔ اس لیے کہ مسلمان کا یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کی حاجت نہیں کہ بندہ پر مصیبت آئے اور وہ اس پر صبر کرے تو اس کے گناہ بخشے جائیں۔ وہ تو یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ کی شان رکھتا ہے۔ بخشش کے لیے بس اُس کی رضا چاہیے۔ مسنون دعاؤں میں اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگنے کی دعا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس شان کا مالک ہے کہ وہ جس کو چاہے دنیا میں مصائب سے بچائے رکھے‘ عافیت کے ساتھ زندہ رکھے اور اُس کی بخشش کر دے۔

❀ ❀ ❀

شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

عبدالرشید عراقی

حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید دہلویؒ خاندانِ ولی اللّٰہی کے گُلِ سرسبد تھے۔ آپ کا شمار ائمہ دین اور بلند پایہ محدثین میں ہوتا ہے۔ شجرۂ نسب یہ ہے: محمد اسمٰعیل شہید بن شاہ عبدالغنی بن شاہ ولی اللہ بن شاہ عبدالرحیم —— آپ کا شجرۂ نسب امیر المؤمنین خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ خاندانِ ولی اللّٰہی دہلوی کا ہر فرد ذی وقار' جیّد عالمِ دین اور علم و فضل کے اعتبار سے صاحبِ کمال تھا۔

محی السنّۃ امیر الملک سید نواب صدیق حسن خاںؒ (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں:

> ھر یکے از ایشاں بے نظیرِ وقت و فرید دھر و وحید عصر در علم وعمل و عقل و فھم و قوتِ تقریر و فصاحتِ تحریر و ورع و تقویٰ ودیانت و امانت و مراتبِ ولایت بود وھم چنیں اولادِ اولاد ...... ایں سلسله از طلائے ناب است۔ (۱)

یعنی ''اس خاندان کا ہر فرد علم و عمل' عقل و فہم' زورِ تقریر' فصاحت تحریر' ورع و تقویٰ' دیانت و امانت اور مراتب ولایت میں یگانہ روزگار' فرید دہر اور وحید عصر تھا۔ ان کی اولاد کی اولاد بھی انہی درجات بلند پر فائز تھی۔ یہ ایک زریں سلسلہ تھا۔''

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ایک جیّد عالمِ دین' دینی مفکّر' قاطع بدعت' بلند پایہ خطیب' واعظ' مقرّر اور مبلّغ تھے۔ وہ غیر معمولی علمی وسعت کے مالک' انتہائی ذہین و فطین' متقی و پرہیزگار' زہد و ورع کے پیکر' دیانت و امانت' عدالت و ثقاہت' شجاعت و بسالت' ذکاوت و ذہانت میں اعلیٰ و ارفع تھے۔ ذکر و فکر' تدبّر اور فہم و بصیرت میں بے مثال تھے۔ اور اس کے ساتھ بہت زیادہ متبع سنتِ نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام تھے۔ مولوی رحمان علی بریلوی لکھتے ہیں:

> ابن مولوی عبدالغنی بن مولانا شاہ ولی اللّٰہ در ریاضت و رسائی فکر یگانه روزگار ومشارٌ الیه علمائ کبار بود

یعنی ''شاہ عبدالغنیؒ کے بیٹے شاہ ولی اللہ کے پوتے دیانت اور فہم و فکر میں یگانہ روزگار

تھے۔ حلقہ علمائے کبار میں مشارٌ الیہ تھے۔''(۲)

حضرت شاہ اسمٰعیل شہید ۱۲/ ربیع الثانی ۱۱۹۳ھ (۱۲/اپریل ۱۷۷۹ء) کو پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم کا آغاز حفظ قرآن مجید سے ہوا۔ ۸ سال کی عمر میں حفظ قرآن مجید کی سعادت سے بہرہ ور ہوئے۔ علوم عالیہ و آلیہ کا آغاز اپنے والد محترم شاہ عبدالغنی دہلویؒ (م ۱۲۲۷ھ) سے کیا۔ والد محترم کی رحلت کے بعد اپنے تایا شاہ عبدالقادر دہلویؒ (م ۱۲۳۰ھ) اور تایا حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ (م ۱۲۳۹ھ) سے علومِ دینیہ میں اکتساب فیض کیا۔ اور دوسرے تایا شاہ رفیع الدین دہلویؒ (م ۱۲۳۳ھ) سے بھی مختلف علوم و فنون میں استفادہ کیا۔ علاوہ ازیں اپنے خاندان کے اساطین علم و فن میں استفادہ کے بعد اس دور کے فاضل اجل مولانا عبدالحیٔ بڈھانوی (م ۱۲۴۲ھ) سے بھی تعلیم حاصل کی۔

ذہانت و ذکاوت میں شاہ اسمٰعیل شہید دہلویؒ اعلیٰ و ارفع تھے اور یہ وصف عطیۂ خداوندی تھا۔ حضرت مولانا سید نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) فرماتے ہیں:

> یعنی ''علوم منقول و معقول میں اس درجہ ماہر تھے کہ انہیں دیکھ کر پرانے لوگوں کی یاد ذہن سے نکل جاتی۔ فروع و اصول میں مہارت کا یہ عالَم تھا کہ اس کے ائمہ سے بھی بڑھ گئے تھے۔ جس علم کے بارے میں آپ نے ان سے بات کی یہ جانا کہ یہ اس کے امام ہیں' اور جس فن میں آپ ان سے مصروفِ گفتگو ہوئے یہ محسوس کیا کہ یہ اس کے حافظ ہیں۔ اصولِ فقہ نوکِ زبان تھا اور قواعد حساب کو چٹکیوں میں حل کر دیتے تھے۔ علومِ قرآن و حدیث ان کے سینے میں محفوظ تھے اور فقہ و منقول میں انہیں پوری مشق حاصل تھی۔''(۳)

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے تحریک جہاد کے سلسلہ میں حضرت سید احمد شہید بریلویؒ کی بیعت کی اور اس کے بعد فنون سپہ گری میں مہارت حاصل کی۔ پھر حضرت سید احمد شہیدؒ کی معیت میں سکھوں کے ساتھ کئی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ آخر ۲۴/ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ / ۵/ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں شہادت سے سرفراز ہوئے۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

اعترافِ عظمت

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م ۱۲۳۹ھ) فرمایا کرتے تھے:

(۱) ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَی الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ﴾

''سب تعریف اُس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے بڑھاپے میں اسمٰعیل و اسحٰق عطا

فرمائے۔‘‘(۴)

(۲) میری تقریر اسمٰعیل نے‘ تحریر رشید الدین نے اور تقویٰ اسحاق نے لے لیا۔(۵)

مولانا حافظ محمد ابراہیم میر سیالکوٹیؒ: ’’مولانا شاہ محمد اسمٰعیل شہیدؒ ائمہ دین اور فقہائے متقین اور بلند پایہ محدثین میں سے تھے۔ آپ قاطع شرک و بدعت و ماحیٔ محدثات و کفریات تھے۔ اتباع سنت اور اجتناب از بدعت کا جو بیج آپ کے دادا شاہ ولی اللہؒ نے بویا وہ آپ کے زمانہ میں خوب پھیلا‘ اور جو کام انہوں نے شروع کیا آپ نے اس کو انجام تک پہنچایا۔ آپ اسلام کے ان اولوالعزم عالی ہمت‘ ذکی جری اور غیر معمولی افراد میں سے تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔‘‘

سیالکوٹ میں علامہ اقبال کی لندن اور جرمنی سے اور میری حرمین شریفین اور دیگر اسلامی ممالک سے واپسی پر علامہ اقبال سے ملکی سیاست پر گفتگو ہو رہی تھی کہ دورانِ گفتگو علامہ اقبال نے فرمایا: ’’اگر مولانا سید اسمٰعیل شہیدؒ کے بعد ان کے مرتبہ کا ایک مولوی بھی پیدا ہو جاتا تو آج ہندوستان کے مسلمان ایسی ذلت کی زندگی نہ گزارتے۔‘‘(۶)

مولانا محمد یوسف بنوریؒ: فالشیخ اسمٰعیل الشھید من ذٰلک الجیل او من ذٰلک الرعیل الذی یشبه تماماً وباولئک الصحابة الذی کانوا اولی نفوس قدسیة و ارواح ذکیة و قلوب تقیة ’’شیخ اسمٰعیل شہیدؒ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہیں نفوسِ قدسیہ‘ ارواحِ زکیہ اور قلوبِ تقیہ کے مالک حضرات صحابہ کرامؓ سے مکمل طور پر مشابہت حاصل ہے۔‘‘(۷)

مولانا محمد اسحاق بھٹیؒ: مولانا محمد اسمٰعیل شہید دہلویؒ علامہ دہر‘ عالم کبیر‘ فقیہہ ذی مرتبت اور محدث دوراں تھے۔ شاہ عبدالغنیؒ کے فرزند‘ شاہ عبدالعزیزؒ‘ شاہ رفیع الدینؒ‘ شاہ عبدالقادرؒ کے بھتیجے‘ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے پوتے اور شاہ عبدالرحیم دہلویؒ کے پڑپوتے تھے۔(۸)

حواشی

(۱) اتحاف النبلاء‘ ص ۴۳۰۔
(۲) تذکرہ علمائے ہند‘ ص ۱۷۹۔
(۳) اتحاف النبلاء‘ ص ۴۱۷۔
(۴) الحیاۃ بعد المماۃ‘ ص ۱۰۹۔
(۵) تواریخ عجیبیہ (سوانح احمدی)‘ ص ۱۴۳۔
(۶) تاریخ اہل حدیث‘ ص ۴۱۳‘ ۴۱۴۔
(۷) دیباچہ عبقات‘ مولانا اسماعیل شہید‘ از مولانا بنوری‘ ص ۲۔
(۸) فقہائے ہند‘ ج ۶‘ حصہ سوم‘ ص ۵۳۵۔

❁❁❁

اسلام کا سیاسی نظام

بسلسلہ "نظامِ خلافت: کیا؟ کیوں؟ کیسے؟" (۷)

شجاع الدین شیخ ☆

ہمارے ملک میں ''سیاست'' ایک ایسا موضوع ہے جس پر وہ شخص بھی گفتگو کرنے کو تیار ہوتا ہے جسے سیاست کا تھوڑا سا فہم بھی حاصل نہ ہو۔ آج کا موضوع عوام کی دلچسپی کے اعتبار سے اہم ہے کیونکہ ہر شخص کم از کم سیاست کی اصطلاح سے واقف ہے اور ہمارے معاشرے میں جو کچھ سیاست کے نام پر ہو رہا ہے اس سے بھی واقف ہے۔ لیکن اس وقت ہمارا موضوع 'اسلام کا سیاسی نظام' ہے۔

ہماری آج کی گفتگو پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ موضوع کی وضاحت اور اس ضمن میں دو تین تمہیدی بیانات پر مشتمل ہے۔ دوسرے حصہ میں سیاسی حوالے سے اسلام کی تعلیمات اور اس ضمن میں ۶ آیات اور ایک حدیث کا تمہیدی طور پر تذکرہ ہو گا۔ تیسرا حصہ بہت ہی مختصر ہے کہ اسلامی ریاست اگر قائم ہو گی تو اس کی بنیادی خصوصیات کیا ہوں گی جو اسے دیگر ریاستوں سے ممتاز کر دیں گی۔ چوتھا حصہ ذرا تفصیل طلب ہے کہ دورِ حاضر میں اسلامی ریاست قائم ہو تو اس کے دستور کی بنیادی صفات کیا ہوں گی۔ اس ضمن میں بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے نو (۹) نکات بیان فرمائے تھے' ان شاء اللہ انہی کو پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ گفتگو کا آخری حصہ اسلامی ریاست کے خدوخال پر مشتمل ہو گا۔ اس میں بھی اکثر باتیں وہی ہوں گی جو ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے بیان فرمائیں' البتہ دو تین اضافی باتیں بھی اس میں شامل ہوں گی۔

مذہبی اور دینی حلقوں میں اگر سیاست کی بات ہو تو بعض لوگوں کی طرف سے کبھی یہ اعتراض ہوتا ہے کہ سیاست تو بڑی گندی شے ہے' اسلام سے اس کا کیا تعلق؟ اس کے برعکس جب کبھی دینی طبقات سے اسلام کے سیاسی نظام کے حوالے سے بات اٹھتی ہے تو عوام الناس کی طرف سے یہ اعتراض آتا ہے کہ یہ سیاست کی بات کر رہے ہیں۔ گویا ہمارے معاشرے میں سیاست کو شجر ممنوعہ یعنی حرام شے سمجھا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔ البتہ جو کام آج ہم سیاست کے طور پر ہوتا ہوا

☆ امیر تنظیم اسلامی حلقہ کراچی شمالی

دیکھ رہے ہیں' یقیناً اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں' البتہ اسلام میں سیاست کی بنیادی تعلیم موجود ہے۔ ہم نے 'معاذ اللہ' سیاست کو گالی سمجھ لیا ہے' جبکہ سیاست عربی زبان کا لفظ ہے جس کے بنیادی معنی انتظام کے ہیں۔ یہ 'انتظام' یعنی سیاست گھر اور مسجد کی بھی ہو سکتی ہے' کسی ادارے کی بھی ہو سکتی ہے' اور یہ ملک گیر سطح پر بھی ہو سکتی ہے۔ اس بارے میں ہمارا دین ہمیں رہنمائی عطا کرتا ہے۔ یہ شجرِ ممنوعہ نہیں بلکہ دین کا حصہ ہے اور اس کی تعلیمات بھی ہمیں عطا فرمائی گئی ہیں۔ بنیادی بات یہ ہے کہ جب دین کو چند عقائد' عبادات اور رسومات تک محدود کر دیا جائے اور بہت سی باتیں جو دین کا حصہ ہیں' انہیں دین کا حصہ سمجھا ہی نہ جائے تو یہ ایک ناقص تصور ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جو دین عطا فرمایا ہے' وہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے اور زندگی کے انفرادی اور اجتماعی تمام گوشوں کے لیے رہنمائی عطا کرتا ہے۔ جہاں عقائد' عبادات اور رسومات کی تعلیم ہے تو وہیں اخلاقیات' حقوق العباد اور معاملات پر راہنمائی بھی ہے۔ جہاں معاشرتی اور معاشی معاملات کے بارے میں تعلیمات ہیں وہیں سیاسی سطح پر بھی رہنمائی اور ہدایات عطا کی گئی ہیں۔ مزید یہ کہ اپنی پوری زندگی کو اس دین کے مطابق ڈھالنے کا مطالبہ بھی موجود ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪﴾ (البقرۃ: ۲۰۸) ''اے اہلِ ایمان! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ''۔ جو لوگ دین کے حصے بخرے کر دیں' کچھ پر عمل کریں اور کچھ پر نہ کریں تو قرآن انہیں مشرک قرار دیتا ہے (الروم: ۳۲'۳۳)۔ اگر اسلام کے کچھ احکامات کو مانیں اور کچھ کو نہ مانیں تو یہ عمل اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہے۔ بلکہ یہاں تک فرما دیا گیا کہ دین پر جزوی عمل کے نتیجے میں قبولیت تو دور کی بات ہے' دنیا میں ذلت و رسوائی اور آخرت میں شدید عذاب ہو گا (البقرۃ: ۸۵)۔ الغرض اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جو زندگی کے تمام گوشوں کے لیے رہنمائی عطا کرتا ہے' جس میں سیاسی تعلیمات بھی شامل ہیں۔ اور پھر دین ہم سے ان سب پر عمل کرنے کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔

اگلی بات بھی تمہیدی نوعیت کی ہے' وہ یہ کہ اس گوشے میں انسانیت کا ارتقاء ہوتا چلا آیا ہے اور آج یہ اپنے ارتقاء کے بہت اونچے مرحلے پر پہنچ چکی ہے۔ نئے نئے مسائل پیش آتے رہے ہیں' آ رہے ہیں اور آتے رہیں گے۔ کبھی انسان غاروں میں رہتا تھا' زندگی بھی سادہ تھی اور درپیش مسائل بھی سادہ تھے اور ان کا حل بھی سادہ تھا۔ پھر لوگوں نے سمندروں اور دریاؤں کے کنارے رہنا شروع کیا' قبیلے وجود میں آ گئے اور قبیلے کا سردار جو حکم دیتا' اسے قبیلے والے مان لیتے۔ اس مرحلہ میں ابھی انسانوں میں اپنی حیثیت کا اور اس کے منوانے اور قبیلے کے معاملات میں اپنے کردار کا شعور بیدار نہیں ہوا تھا۔ پھر چند قبائل مل جل کر ایک جگہ رہنے لگے۔ مکہ مکرمہ میں ایک ہی قبیلہ 'قریش'

آباد تھا اور اسی کا راج تھا۔ مدینہ منورہ میں دو قبیلے اوس و خزرج اور تین یہودی قبیلے تھے۔ اس طرح کی صورتِ حال میں اجتماعی معاملات اور انتظامات کا حل مشکل ہوگیا' پیچیدگیاں بڑھنے لگیں۔ جیسے جیسے یہ ارتقاء ہوتا گیا' ویسے ویسے مسائل میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ آج کے دور میں دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے اور فون اور انٹرنیٹ نے فاصلوں کو ختم کر دیا ہے' لیکن انسانیت کے ارتقاء کے نتیجے میں پیچیدگیوں میں اضافہ ہو رہا ہے اور بڑے بڑے مسائل جنم لے رہے ہیں۔

دین کی خوبصورتی یہی ہے کہ دین نے اس گوشے میں لچک عطا فرمائی ہے جہاں ارتقاء کے امکانات بہت زیادہ تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اصولی اور بنیادی ہدایات عطا کر دی گئیں' جبکہ سنتِ مطہرہ میں تفصیلات عطا ہوئی ہیں۔ کتاب و سنت کی ہدایات پر مبنی خلافتِ راشدہ کا نظام قائم ہوا' چنانچہ آج بھی رہنمائی وہیں سے لی جاتی ہے۔ وہاں جو اصول متعین ہوئے' ان کو سامنے رکھا جائے گا۔ انسانیت کے ارتقائی شعور کے نتیجے میں عصر حاضر میں کچھ ادارے وجود میں آئے ہیں تو انہیں بھی سامنے رکھنا پڑے گا تاکہ عصرِ حاضر میں اگر اسلامی ریاست قائم ہو تو اصولی بنیادی رہنمائی کو سامنے رکھ کر آج کے دور کے تقاضوں کی تکمیل کے لیے کوئی نظام وضع کیا جا سکے۔

قرآن و سنت کی چند اصولی اور بنیادی ہدایات کے تحت آج کے دور میں سیاسی سطح پر کچھ سیاسی قوانین مرتب کرنے میں سہولت میسر آ سکتی ہے۔ پہلا اصول قرآن حکیم میں تین مقامات پر بیان ہوا ہے: ﴿اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ (الانعام:۵۷' یوسف:۴۰ و ۶۷) کہ حکم کا اختیار صرف اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے۔ ہمارے ہاں اکثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ دین میں جبر نہیں ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ انفرادی طور پر کسی کو بندوق کے زور پر اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا' ہر شخص کو عقیدے کی آزادی حاصل ہے۔ سورۃ الدھر (آیت ۳) میں ارشاد ہوا کہ انسان چاہے شکر گزار بنے چاہے ناشکرا بنے' لیکن اجتماعی سطح پر اللہ تعالیٰ اپنی حاکمیت' اطاعت اور قانون کے سوا کسی اور کی حاکمیت' اطاعت اور قانون کو ماننے کے لیے تیار نہیں۔ تاریخ انسانی میں یہی جھگڑا رہا ہے کہ انسان نے خدائی کے دعوے کیے۔ کہیں فرعون کا قول نقل کیا گیا: ﴿اَنَا رَبُّکُمُ الۡاَعۡلٰی﴾ (النازعات: ۲۴) ''میں تمہارا سب سے بڑا رب ہوں''۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے کہ اگر مشرکین سے پوچھا جائے کہ بتاؤ زمین و آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ کہیں گے اللہ نے! بتاؤ بارش کون برساتا ہے؟ کہیں گے اللہ! اللہ تعالیٰ کو خالق اور رب تو مشرکینِ مکہ بھی تسلیم کرتے تھے' لیکن اسے حاکم اور مالک ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ آج بھی ایسا ہی ہے۔ کبھی کوئی قوم کھڑی ہو کر دعویٰ کرتی ہے کہ ہم زمین پر سپر پاور ہیں' ہم چاہیں تو دنیا کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں۔ تاریخ میں اسی بات کا جھگڑا رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر ہرگز تیار نہیں کہ کسی اور کو حاکم مانا جائے' حتیٰ کہ اپنی حاکمیت اور دین کے نفاذ کے

لیے اللہ فرماتا ہے کہ قتال بھی کرنا پڑے تو کرو! سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۹۳ اور سورۃ الانفال کی آیت ۳۹ میں فرمایا: ﴿وَقَاتِلُوۡھُمۡ حَتّٰی لَا تَکُوۡنَ فِتۡنَۃٌ وَّیَکُوۡنَ الدِّیۡنُ کُلُّہٗ لِلّٰہِ﴾ ''جنگ کرو ان کے خلاف یہاں تک کہ کوئی فتنہ باقی نہ رہے اور دین کل کا کل اللہ ربّ العالمین کے لیے ہو جائے!''

دوسرا اصول سورۃ الحجرات (آیت ۱) میں بیان ہوا: ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ﴾ ''اے اہل ایمان! اپنے معاملات کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے نہ بڑھاؤ''۔ قرآن حکیم میں ۱۱ مرتبہ ارشاد ہوا' مثلاً سورۃ التغابن کی آیت ۱۲ میں فرمایا: ﴿وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو اس کے رسول ﷺ کی''۔ چنانچہ قانون جو بھی بنے گا وہ قرآن و سنت کی تعلیمات پر مشتمل ہوگا۔ جہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے کوئی حد (limitation) مقرر کر دی اس کے اندر رہ کر جو چاہے قانون سازی کر لو' اس سے باہر نہیں جا سکتے۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ صاحب امر کی بات بھی ماننا لازم ہے۔ رسول اللہ ﷺ اب تمہارے سامنے موجود نہیں ہیں۔ تاہم تمہارا کوئی نظام ہوگا اور اس کو چلانے والا کوئی ذمہ دار ہوگا تو اس کی بات مانو۔ چنانچہ سورۃ النساء میں فرمایا: ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ﴾ (آیت ۵۹) ''اے اہلِ ایمان! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ﷺ کی اطاعت کرو اور ان کی جو تم میں صاحبِ امر ہوں''۔ ہمارے دانشوروں کی طرف سے اس آیت کا بہت حوالہ دیا جاتا ہے' بلکہ وہ اس کا غلط مطلب اخذ کرتے ہیں۔ اللہ انہیں بھی ہدایت دے اور ہمیں بھی ہدایت دے۔ وہ کہتے ہیں کہ حکمران تو حکمران ہیں' لہٰذا ان کی ہر بات ماننی چاہیے۔ حقیقت میں ایسا نہیں ہے' بلکہ حکمرانوں کی اطاعت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کے تحت ہے۔ قربان جائیے اللہ کے کلام پر جس میں اس کی دلیل بھی موجود ہے کہ یہاں اللہ اور رسول ﷺ کے ساتھ اطاعت کا لفظ آیا ہے لیکن اولوالامر کے ساتھ اطاعت کا لفظ نہیں ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت غیر مشروط' مگر صاحبِ امر کی اطاعت مشروط ہے اور اس کی ہر بات نہیں مانی جائے گی۔ ابوداؤد کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ''مخلوق کی ایسی اطاعت جائز نہیں جس میں خالق کی نافرمانی ہوتی ہو''۔ اگر کسی بھی مخلوق کا حکم خالق کے حکم سے ٹکرائے گا تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔ بخاری کی حدیث کے مطابق ''اطاعت صرف معروف میں ہوگی' منکر میں نہیں ہوگی''۔ والدین ہوں' ادارے یا حکومت کا سربراہ ہو' اگر اس کا حکم اللہ یا اس کے رسول ﷺ کے حکم سے ٹکرائے تو اس کی بات نہیں مانی جائے گی۔

چوتھی بات یہ کہ جن کو اللہ اقتدار دے دے' ان کی اولین ذمہ داری کو سورۃ الحج میں بیان کیا گیا: ﴿اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ

وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ﴾ (آیت ۴۱) ’’جن کو ہم زمین میں اقتدار اور اختیار دیں گے تو وہ نماز کا نظام قائم کریں گے‘ زکوٰۃ کا نظام قائم کریں گے‘ نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے‘‘۔ یہ اصول مسجد کے پیش امام سے لے کر حکومت کے سربراہ کی امامت تک جائے گا۔ زکوٰۃ کے نظام میں سماجی بہبود کا پورا تصور آئے گا کہ اگر فرات کے کنارے کوئی کُتا بھی بھوکا مر جائے تو سیدنا عمر فاروق ؓ فرماتے ہیں کہ میں جواب دہ ہوں! یہ بھی یاد رکھیے کہ اسلامی ریاست اپنے عوام کی صرف مادی ضروریات کو ہی نہیں بلکہ ان کی روحانی‘ اخلاقی اور آخرت کی ضروریات کو بھی پورا کرنے کی کوشش کرے گی۔ ان کے دین و ایمان کی حفاظت پر عمل کرنے کے مواقع اور آخرت کی تیاری کی بھی ذمہ دار ہوگی۔ اگر وہ نیکی کا حکم نہیں دیتے اور برائی سے روک نہیں سکتے تو ایسے لوگ حکمران بننے کے اہل نہیں ہیں۔ اگر وہ نماز کی امامت نہیں کرا سکتے یا وہ انسانیت کی فلاح و بہبود کا کام نہیں کر سکتے تو وہ اس قابل نہیں کہ ہمارے حکمران ہوں۔

اس آیت کے آخری حصہ ﴿وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾﴾ ’’اور تمام کاموں کا انجام اللہ کے اختیار میں ہے‘‘ کے ضمن میں مولانا مودودیؒ نے لکھا ہے کہ اللہ نے تمہیں حکمران بنایا ہے تو تم ذمہ دار ہو۔ اگر تم اپنی ذمہ داری ادا نہیں کرتے تو یاد رکھو کہ اللہ کے حضور تمہیں جواب دہی کرنی ہے۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’تم میں سے ہر ایک راعی ہے‘ نگہبان ہے‘ جو لوگ اس کے تحت ہیں اس کے بارے میں اس سے سوال ہوگا‘‘۔ باپ سے اولاد کے متعلق‘ شوہر سے بیوی کے متعلق‘ بیوی سے شوہر کے گھر‘ بستر اور اولاد کے بارے میں سوال ہوگا۔ مالک سے غلام کے متعلق‘ حکمران سے اس کی رعایا کے متعلق سوال ہوگا۔

سورۃ الشوریٰ کی آیت ۳۸ میں ایک اصول دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے باہمی معاملات آپس کے مشورے سے طے ہوتے ہیں۔ خلیفہ کے انتخاب سے لے کر لوگوں کے قانون سازی کے لیے منتخب کیے جانے تک سارے مباحث اس آیت کے تحت سمجھے اور سمجھائے جا سکتے ہیں۔ یہ مشاورت کی روح اسلام کے سیاسی نظام کا ایک بہت اہم گوشہ ہے جس کی طرف یہاں رہنمائی عطا کی گئی۔ سورۃ النور‘ آیت ۵۵ میں خلافت کے عطا کیے جانے کا وعدہ اللہ کی طرف سے ہے۔ فرمایا کہ اللہ نے وعدہ فرمایا تم میں سے ان لوگوں سے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک اعمال کیے کہ اللہ انہیں ضرور زمین پر خلافت عطا فرمائے گا جیسا کہ اس نے پچھلے لوگوں کو خلافت عطا فرمائی تھی۔ یہ خطاب تمام مسلمانوں سے ہے۔ پہلے انبیاء خلیفہ ہوا کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا کہ اے داؤدؑ! ہم آپ کو زمین میں خلیفہ بنانے والے ہیں۔ سیدنا آدمؑ کے متعلق فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ لیکن اب ختم نبوت کے بعد دین کو آگے بڑھانے اور پھیلانے والی ذمہ داری

جس طرح امت کے کاندھوں پر آ گئی ہے‘ اسی طرح اب خلافت کی ذمہ داری بھی مجموعی اعتبار سے اس پر عائد ہوگئی ہے۔ گویا پہلے خلافت شخصی تھی اور اب خلافت عوامی ہو چکی ہے۔ عوام اپنے میں سے کسی کو یہ اختیار تفویض کر دیں کہ تمہیں خلیفہ منتخب کیا جاتا ہے‘ قرآن و سنت کے مطابق ہماری رہنمائی کرو! شرعی طور پر خلافت کو سمجھنے کے لیے امام ماوردیؒ‘ ابن تیمیہؒ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سب فرماتے ہیں کہ خلافت کی شرعی معنوں میں تعریف یہ ہے کہ وہ تمام امور جنہیں بجا لانے کے لیے رسالت مآب ﷺ کو بھیجا گیا‘ ان کی نیابت کرنا۔ سورۃ البقرۃ‘ آیت ۱۴۳ کے مطابق جیسے ختم نبوت کے بعد امت دین کی شہادت یعنی گواہی دینے کی ذمہ دار ہے ویسے ہی خلافت کے حوالے سے اجتماعی طور پر ذمہ دار ہے۔

مسند احمد کی روایت کردہ ایک بہت مشہور و معروف حدیث کے مطابق رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مومن کی مثال ایک گھوڑے کی سی ہے۔ اگر آپ گھوڑے کو کھلا چھوڑ دیں تو وہ بھاگ جائے گا لہٰذا اس کو آپ باندھ کر رکھتے ہیں تاکہ وہ قابو میں رہے۔ اس کو رسی سے باندھا جائے تو جتنی بڑی رسی ہوگی اتنی ہی اسے آزادی حاصل ہوگی۔ اس کے آگے اس کی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ مومن کی مثال کھونٹے سے بندھے ہوئے ایک گھوڑے کی ہے۔ جس رسّی سے اسے باندھا گیا ہے اس سے بننے والے دائرے کے اندر اسے آزادی ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ مؤمن بھی اللہ کے قائم کیے ہوئے دائرے کے اندر قرآن و سنت کی روشنی میں جو چاہے کرے۔ ایک مؤمن جس طرح اللہ کے حکم اور اس کی توحید کے تقاضوں پر عمل درآمد کرنے کا پابند ہے‘ ایسے ہی ایک مسلمان معاشرہ اور اس میں قائم ہونے والی ایک اسلامی ریاست بھی اللہ کے حکم پر عمل درآمد کرنے کی پابند ہے اور وہ اس دائرے کے اندر رہ کا کام کر سکتی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے اس کے لیے مقرر فرما دیا ہے۔

آج کی گفتگو کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اگر ایک اسلامی ریاست قائم ہو تو اس کی بنیادی صفات کیا ہوں گی جو اسے بقیہ ریاستوں سے ممیز کر دیں گی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر صاحبؒ نے دو باتیں بیان کی ہیں۔ اسلامی ریاست کے لیے پہلا بنیادی اصول یہ ہے کہ حاکمیت کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ ہم مختارِ کل نہیں‘ بلکہ ہم اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے بندے اور زمین پر اللہ کے نمائندے ہیں۔ جب پاکستان قائم ہوا تو دنیا میں سیکولرزم کا ڈنکا بج رہا تھا اور سیکولرزم سے متعلق بڑے خوبصورت نعرے لگ رہے تھے‘ مثلاً حاکمیت اللہ کے لیے نہیں‘ بندوں کے لیے ہے۔ حکومت لوگوں کے لیے ہے‘ لوگ کریں گے اور لوگوں کے لیے کریں گے۔ یہاں کسی الہامی کتاب کا کوئی حوالہ نہیں آئے گا ___ یہ سیکولرزم ہے اور یہ اللہ کے خلاف بدترین بغاوت ہے کہ اس کی عبادت‘ حاکمیت‘ اطاعت یا

اس کے حق کو چند مذہبی عبادت خانوں تک محدود کرلیا جائے۔ یہی تصورات آج ہماری عظیم اکثریت کے ہیں۔ اسی لیے جیسے ہی سیاست کا لفظ آتا ہے' ہمیں الرجی ہونے لگتی ہے حالانکہ ع ''جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی''۔ وہ چنگیزی آپ عراق' افغانستان اور پاکستان میں دیکھ لیں۔ جمہوریت کا یہ مکروہ چہرہ آج دنیا کے سامنے آرہا ہے۔

ہم وہ قوم تھے جن کے آباء واَجداد نے پندرہ لاکھ سے زیادہ جانیں قربان کیں' جو اپنی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمتوں کو لٹتا ہوا دیکھ کر آئے تھے۔ اس لیے کہ انہوں نے کہا تھا کہ اے اللہ! ہمیں ایک آزاد خطۂ ارضی عطا فرما دے جہاں ہم تیرے دین کو نافذ کریں گے' تیری اور تیرے رسول ﷺ کی اطاعت کریں گے۔ ہم تو پوری دنیا کے باغی ہیں' ان معنوں میں کہ ہم نے اپنے دستور میں یہی بات لکھ دی: Sovereignty belongs to Allah. کہ حاکمیت اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ قراردادِ مقاصد 1949ء کے آرٹیکل 1 میں یہی لکھا ہوا ہے کہ تمہارا ہمارا قانون اور تمہاری ہماری حاکمیت نہیں چلے گی بلکہ حاکمیت صرف اللہ کی چلے گی۔ یہ دنیا کو آنکھیں دکھانے والی بات ہے کہ تمہارا نظام اور تمہارا قانون نہیں' اللہ کا نظام اور قانون چلے گا۔

آگے ذرا تلخ اور کڑوی گولی ہے کہ اسلامی ریاست اسلامی نظریے کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ وہ نظریہ ہمارا کلمۂ شہادت ہے۔ جو اس نظریے کو مانتا ہے وہ اس ریاست کا اصل شہری ہے۔ جو اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتا وہ ریاست کا ہمدرد کیسے ہوسکتا ہے؟ اسلامی ریاست کی قانون سازی کیا کوئی بھگوان داس کرے گا' چاہے وہ ایم اے اسلامیات ہی کیوں نہ ہو؟ (میں اسلامی ریاست کی بات کر رہا ہوں' پاکستان کی نہیں) البتہ ٹیکنیکل معاملات میں غیر مسلموں کی شمولیت ہوسکتی ہے۔

آپ یہ توقع کر رہے ہوں گے کہ آج میں انتخابات' سیاسی جماعتوں' این آر او اور عدلیہ کے حوالے سے کچھ بتاؤں گا۔ یقیناً کچھ اصولی باتیں آگے آپ کے سامنے آئیں گی' لیکن ایک بات توجہ کے ساتھ سن لیجیے کہ اگر واقعی اسلامی ریاست ہو جہاں واقعتاً اللہ کی حاکمیت قائم ہو جائے تو ایسا ہوگا۔ اللہ کرے کہ ایسا ہو' لیکن اس کے لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ اس خطے پر اسلام کے غلبے کی جدوجہد کریں۔ اب جو باتیں ہوں گی وہ آئیڈیل ہیں' لیکن انہیں سمجھنا ضروری ہے۔ اسلام کی آمد کے نعرے لگانا بہت اچھی بات ہے' لیکن حکومت مل جائے تو کیا کیا جائے گا؟ اس کا جواب بھی تو ضروری ہے۔ ایک نظام تو ہمارے پاس الحمدللہ لکھا ہوا ہے' لیکن اس پر عملدرآمد نہیں ہو رہا ہے۔ افسوس کہ ہم دنیا میں کوئی خطہ ایسا پیش نہیں کر سکتے کہ جس کو دیکھ کر اسلام کی برکات لوگوں پر منکشف ہوں۔ اسلام کے غلبے کے لیے سختیاں بھی برداشت کرنی پڑیں گی۔ اگر رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام ؓ کا اس جِدّوجُہد میں خون بہا جو کہ مبارک ترین خون تھا تو کم از کم ہمارا پسینہ تو بہے۔

جب اہلِ ایمان غزوۂ تبوک کے لیے نکلنے لگے تو منافقین کہنے لگے: ''اتنی شدید گرمی میں مت نکلو!'' اس پر اللہ ربّ العزت نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا کہ آپؐ ان سے فرما دیجیے کہ جہنم کی آگ اس سے شدید تر ہے''۔ اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ — اگر جہنم کی آگ کا تصور سامنے رہے تو دنیا کی گرمی کچھ نہیں۔ گرمی اس لیے برداشت کرنی ہے اور قوت وصلاحیت اس لیے لگانا ہے تاکہ اللہ کا دین نافذ ہو اور اس کی برکات دنیا والوں کے سامنے آئیں۔ ہم نہ سہی' یہ برکات کوئی اور دیکھ لے۔ یہ سب کچھ صدقۂ جاریہ تو ہوگا۔

آج کی گفتگو کا چوتھا حصہ یہ ہے کہ اسلامی ریاست اگر قائم ہوتی ہے تو اس کے دستوری نکات کیا ہوں گے؟ دستور سب سے بالا ہے' اس کے تحت آرڈیننس اور بلز آتے ہیں' رولز اور ریگولیشنز آتے ہیں۔ اصولی باتیں سمجھنی ہیں۔ اس حوالے سے ڈاکٹر اسرار احمدؒ نے نو نکات بیان فرمائے۔ یہ ان کی اس معاملے میں خاص اسپیشلائزیشن تھی۔ وہ ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے لیکن الحمدللہ جب انہوں نے معیشت پر بات کی تو اچھے بھلے ماہرین معاشیات نے کہا کہ اللہ نے انہیں معیشت کے معاملات سمجھنے کی خاص توفیق عطا فرمائی ہے۔ جب کبھی وہ ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن اور ماہرین قانون کے ساتھ بیٹھے تو انہیں تسلیم کرنا پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کا فہم دیا ہے۔ سماجی ارتقاء اور غور وفکر کے بعد انسانیت نے جو سیاسی ادارے بنائے ہیں' ان کا بھی خاص ملکہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو عطا فرمایا تھا۔ میں ان کے شاگرد کی حیثیت سے ان کی تفصیلی باتوں کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ انہوں نے جو نو دستوری نکات بیان فرمائے ان میں پہلا نکتہ یہ ہے کہ اب خلافت اجتماعی ہے۔ خلافت کی ذمہ داری مجموعی اعتبار سے مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ اب یہ مل کر کسی ایک خلیفہ کا تقرر کریں گے۔ اس تقرر کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے' اس کا بیان سورۃ الشوریٰ' آیت ۳۸ میں آ گیا کہ ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوں گے۔ خلفائے راشدین کے دور میں جائیں تو سیدنا ابوبکر صدیق ؓ کو مشورے کے بعد ہی سہی سیدنا عمر فاروق ؓ کی طرف سے نامزد کیے گئے۔ سیدنا عمر فاروق ؓ چھ افراد کی کمیٹی بناتے ہیں۔ اس میں بھی مشاورت ہوتی ہے۔ سیدنا علی ؓ کی خلافت پر بہرحال مشاورت سے اتفاق ہو جاتا ہے۔ یہ مختلف طریقے ہمیں دور خلافت راشدہ میں ملتے ہیں۔

اُس زمانے میں قبائلی زندگی تھی تو ایک ایک فرد کے پاس جا کر پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ قبیلے کے سردار نے کہہ دیا' سب نے مان لیا۔ ان کا ارتقاء ابھی یہیں تک پہنچا تھا' لیکن آج دنیا ارتقاء میں ترقی کرتے کرتے ایک فرد کے حق تک پہنچ چکی ہے۔ اب کسی خلیفہ کے انتخاب کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ مشورہ تو کرنا ہے لیکن یہ کس حد تک کیا جائے' کن لوگوں سے کیا جائے' کس

عمر کے لوگوں سے کیا جائے؟ مثلاً ایک رائے ہے کہ اگر ووٹ ہی لینا ہے تو چالیس سال عمر کی پابندی لگائی جائے‘ اس لیے کہ قرآن سورۃ الاحقاف کی آیت ۱۵ میں ذہنی بلوغت کی عمر چالیس سال بیان کرتا ہے۔ اس پر سوچا جا سکتا ہے۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ سارے بالغ لوگوں سے ووٹ لیا جائے‘ تو لے لیجیے‘ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن اصول اوپر سے طے ہوگا۔ اکثریت کے ووٹ کی بنیاد پر کون آئے گا؟ کوئی بدمعاش بھی تو آ سکتا ہے۔ کیا اس کا امکان اسلامی ریاست میں ہوگا؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خلیفہ تو دور کی بات ہے‘ پاکستان کے دستور کے آرٹیکل ۶۲۔۶۳ ہی میں ایک بات لکھی ہوئی ہے کہ اگر کوئی شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہے تو وہ اس ملک کی پارلیمنٹ کا ممبر نہیں بن سکتا۔ جب وہ پارلیمنٹ کا رکن نہیں بن سکتا تو ملک کا سربراہ بننے کا تو سرے سے کوئی امکان ہی نہیں۔ لہٰذا اسی کو apply کردو۔ کون اس چھلنی سے چھن کر آئے گا ذرا غور کر لیجیے۔ کیا مختلف سیاسی جماعتیں ہو سکتی ہیں؟ اگر ہو سکتی ہیں تو ان کا اختیار کتنا ہوگا؟ کہاں ان کی حدود ہوں گی؟ کیا ان کے ذریعے سے انتخاب کا عمل ہوگا یا عوام الناس سے کوئی انتخاب کروایا جائے گا؟ کس عمر کے لوگ ووٹ دینے کے حقدار ہوں گے؟ یہ وہ پہلو ہیں جن میں لچک بہت زیادہ ہے۔ انتخابی سیاست کے ذریعے اسلامی انقلاب نہیں آ سکتا۔ یہ ہماری سوچی سمجھی رائے ہے اور اس ملک کی ۶۸ برس کی تاریخ اس پر شاہد ہے۔ وہ انقلاب انقلابی راستے سے ہی آئے گا۔ اس کے بعد عوام الناس کی شمولیت کا معاملہ آئے گا۔ اسلام کی شورائیت کی روح اور عصر حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر خلیفہ کے انتخاب کی کوشش کی جا سکے گی۔

ریاست کے اعضائے ثلاثہ (اب چوتھا میڈیا بھی بننا شروع ہو گیا ہے) یعنی مقنّنہ‘ جہاں قانون سازی ہوتی ہے‘ عدالت‘ جہاں مقدمات کے فیصلے ہوں گے اور انتظامیہ — تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں یہ ادارے وجود میں آئے۔ اسلامی ریاست میں یہ تینوں ادارے فعال کردار ادا کر سکتے ہیں‘ بشرطیکہ اللہ کی حاکمیت کا اصول اور معاملات کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے نہ بڑھانے کا اصول طے ہو جائے۔ اسلامی ریاست میں پارلیمنٹ کو شوریٰ کہا جا سکتا ہے۔ اسلامی ریاست میں قانون سازی کرنے والوں کو دین کی سمجھ بوجھ ہونا ضروری ہے۔ اس پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر تو پارلیمنٹ میں مذہبی طبقہ غالب آ جائے گا‘ مولویوں کی حکومت آ جائے گی‘ جس کو ہمارا دانشور طبقہ ’تھیوکریسی‘ کہتا ہے۔ جہاں تک تو یہ بات ہے کہ اسلام غالب ہو‘ قرآن وسنت کی بالادستی ہو‘ اگر اس پر بھی کسی مسلمان کو اعتراض ہے تو اس کے لیے کوئی اور فیصلہ کرنا پڑے گا۔ لیکن اگر اعتراض یہ ہے کہ خالص مذہبی طبقہ کیوں غالب آ جائے تو اس پر بحث ہو سکتی ہے۔ دو باتیں الگ الگ سمجھ لیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ کہتے تھے کہ صدارتی نظام خلفائے راشدین کے زمانے اور اسلام کے مزاج سے مطابقت

رکھتا ہے۔ شوریٰ‘ جہاں عوام نے قانون سازی یا اجتہاد کرنے کے لیے کچھ لوگوں کو منتخب کر کے بھیجا تو وہاں اگر کوئی نیا مسئلہ پیش آتا ہے جس پر دین کی رہنمائی کی ضرورت ہو تو دینی رہنمائی تو دین کا فہم رکھنے والا ہی دے سکتا ہے۔ چنانچہ کچھ ماہرین اور علماء وہاں موجود ہوں گے جنہیں مجلسِ شوریٰ طلب کر سکتی ہے۔ پارلیمنٹ طے کرے کہ اگر ایک سے زیادہ اجتہاد یا آراء آئی ہوں تو کون سا اجتہاد یا رائے نافذ ہوگی۔ یہ شوریٰ یا مقنّنہ کا کردار ہوگا۔

عام آدمی کو قانون سازی میں شرکت کا موقع کیسے مل سکتا ہے؟ عام آدمی اگر یہ سمجھتا ہے کہ فلاں قانون تو بن گیا لیکن یہ قرآن وسنت کے خلاف ہے‘ تو وہ کیا کرے؟ مثلاً حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ یہ فیصلہ کرنے لگے کہ مہر کی رقم کی حد مقرر کر دی جائے تو ایک بوڑھی خاتون کھڑی ہو گئیں۔ کہنے لگیں کہ عمر تمہیں یہ اختیار کس نے دیا ہے‘ جبکہ قرآن کہتا ہے کہ ڈھیروں بھی دے دیا ہے تو واپس نہیں لے سکتے۔ جب اللہ ”ڈھیروں“ کا لفظ استعمال کر رہا ہے تو تجھے کیا حق ہے کہ تو حد مقرر کرے؟ سیدنا عمر فاروق جن کی خلافت کی وسعت ۲۲ لاکھ مربع میل پر محیط تھی‘ نے فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ایک بوڑھی خاتون نے عمر کو اللہ کا دین سکھا دیا۔ اس کی آج عملی صورت کیا ہوگی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عدالت عظمیٰ کا دروازہ کھٹکھٹانے کا امکان موجود ہو۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ کوئی قانون قرآن وسنت کے خلاف منظور ہوا ہے‘ تو آپ عدالت عظمیٰ سے رجوع کریں۔ عدالت میں بیٹھے جج اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں اگر وہ دین کا علم بھی رکھتے ہوں‘ ورنہ علماء کا بورڈ بنایا جائے اور انہیں عدالت میں بٹھایا جائے۔ وہاں آپ اپنے موقف کے حق میں دلائل دیں۔ اگر دلیل وزنی ہے تو عدالت اس قانون کو کالعدم قرار دے گی اور مجلس شوریٰ یا پارلیمنٹ کو عدالت حکم دے گی کہ وہ قانون میں تبدیلی کرے۔ یہ ایک آئیڈیل صورت ہے کہ ایک عام آدمی بھی قانون کے غلط ہونے پر اس کی نشاندہی کر سکتا ہے۔ یوں قرآن وسنت کی چھتری میں مجلس شوریٰ قانون سازی کرے گی۔ یہ تجویز اولاً علامہ محمد اسد صاحب نے پیش کی تھی جسے دین کا علم رکھنے والوں نے قابل عمل سمجھا۔ اس طرح ممکن ہے کہ کسی مسئلے پر مختلف اجتہادی آراء آئیں اور اس صورت میں مجلس شوریٰ کو یہ اختیار ہوگا کہ جس رائے کو وہ بہتر سمجھے‘ اس کے مطابق قانون سازی کرے۔

دستوری نکات کے حوالے سے اگلا نکتہ سیاسی جماعتوں کے کردار کا ہے۔ اس وقت کی سیاسی جماعتوں کو ذہن میں رکھ کر اگلی گفتگو کو نہ سنئے گا۔ ہمارے ہاں کی سیاست اور سیاسی پارٹیوں کا جو کردار ہے وہ دنیا کی بدترین جمہوریت میں بھی نہیں ہے۔ کیا آپ کو پتا ہے کہ امریکہ میں جو بڑی بڑی پارٹیاں ڈیموکریٹک اور ریپبلکن ہیں‘ ان کے صدور کے نام کیا ہیں؟ مجھے بھی نہیں پتا۔ اسی طرح برطانیہ کی بڑی بڑی پارٹیوں کے صدور کے ناموں سے بھی ہم واقف نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں بڑی

بڑی پارٹیوں کے اندر جمہوریت نہیں ہے۔ ہماری سیاسی پارٹیوں میں بدترین آمریت ہے۔ یہ پارٹیوں کے اندر الیکشن ہی نہیں کرواتے۔ ہماری سیاسی پارٹیوں میں بلوغت نہیں۔ ہمارا میڈیا بھی اب تک طفلِ مکتب ہے۔ کسی مجرم کو پھانسی ہو جائے تو اسے بھی بریکنگ نیوز بنا دیتا ہے۔ اسی طرح ہماری سیاسی پارٹیوں میں جو لوگ موجود ہیں‘ وہ بے چارے ابھی سیاسی شعور سے نابلد ہیں۔ ان کو ابھی اس کے لیے بہت وقت درکار ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر اسلامی ریاست قائم ہوگی تو کیا اس میں سیاسی جماعتوں کی گنجائش ہوگی؟ بالفرض اگر ہو تو کیا انہیں مکمل آزادی ہوگی یا وہ کچھ حدود کی پابند ہوں گی؟ ڈاکٹر اسرار احمدؒ فرماتے تھے کہ سیاسی جماعتیں ہو سکتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کیا کسی جماعت کے منشور میں کوئی خلافِ قرآن وسنت بات ہو سکتی ہے؟ ظاہر ہے کہ اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایسی کسی سیاسی جماعت کو اجازت ہی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اس ریاست کی سیاست میں حصہ لے۔ اسی طرح اگر اس کے کچھ نمائندے شوریٰ میں آتے ہیں تو ان نمائندوں کی چھان بین ہونی چاہیے۔ چور‘ اُچکے‘ بدمعاش اور کسی گناہ کبیرہ کے مرتکب افراد کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

پانچویں بات آزادی اور پابندی کا حسین امتزاج ہے۔ آزادی ایک فرد کی بھی ہوتی ہے‘ لیکن اگر فرد کی آزادی اجتماعیت کے لیے نقصان دہ ہو تو پابندی لگنی چاہیے۔ شوریٰ کے ارکان کو اپنی رائے کے اظہار میں آزادی ہونی چاہیے۔ اپنی رائے کا ڈٹ کر اظہار کریں‘ مگر اظہار کا کوئی ایسا رویہ قابل قبول نہیں کہ جس کے ذریعے کوئی اسکینڈل کھڑا ہو جائے‘ لوگوں پر کیچڑ اچھالا جائے۔ سیاسی جماعتوں کو کام کرنے کا موقع دیا جا سکتا ہے بشرطیکہ ان کے منشور میں خلافِ قرآن وسنت کوئی بات موجود نہ ہو۔

ہماری قوم کا ایک بہت بڑا مسئلہ فقہی مسائل کا ہے۔ عام طور پر بڑے طنزیہ انداز میں پوچھا جاتا ہے کہ کس کا اسلام آئے گا؟ دیوبندیوں کا یا بریلویوں کا یا اہل حدیث کا؟ یہ تو ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے کو بھی تیار نہیں! اگر اسی انداز میں یہ پوچھا جائے کہ اے مغرب سے مرعوب دانشورو! تم کس جمہوریت کی بات کرتے ہو؟ فرانس کی جو ایک مسلمان عورت کو نقاب پہننے کی اجازت نہیں دیتی‘ یا امریکی ڈیموکریسی کہ جس پر وہ خود متفق نہیں؟ ان سب کا مکروہ چہرہ ہمارے سامنے آ چکا ہے۔ تم کس منہ سے ہم سے پوچھتے ہو کہ کس کا اسلام آئے گا؟ یہ تو جارحانہ انداز تھا۔ علمی انداز سے بات یہ ہوگی کہ جہاں تک یہ سوال ہے کہ کس کے مسلک کا اسلام آئے گا‘ تو اللہ ان علمائے کرام کو جزائے خیر دے جو اس مسئلے کو آج سے عشروں پہلے طے کر کے اس دنیا سے جا چکے ہیں‘ الحمد للہ۔ اس ملک کے تمام مکاتبِ فکر کے چوٹی کے علماء ۱۹۵۵ء میں جمع ہوئے جن میں سید سلیمان ندویؒ‘ مولانا مودودیؒ اور دیگر بڑے بڑے علمائے کرام شامل تھے‘ جو آج کے علماء کرام کے

اساتذہ کے اساتذہ تھے۔ ۳۱ علماء نے ۲۲ نکات پر اتفاق کیا کہ اگر ان نکات پر وفاق سے صوبے اور ضلع کی سطح تک کوئی حکومت قوانین لے کر آتی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ میری ناقص معلومات کے مطابق ۱۹۶۶ء میں اس پر دوبارہ دستخط کیے گئے تھے۔ وہ دستاویز آج بھی موجود ہے۔ بدقسمتی سے ہم فروعی مسئلوں پر الجھتے رہتے ہیں‘ ان مسئلوں پر ریاست کی جانب سے کوئی مداخلت نہیں ہوگی۔ یہ اختلافِ رائے تو امت کے فقہاء اور ائمہ کے درمیان موجود تھا‘ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ اس بارے میں کئی ممکنات ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اعلیٰ سطح پر قرآن وسنت کی بالادستی ہو‘ اور اس کے تحت ہم کیا کیا options اختیار کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایران میں اہلِ تشیع کی اکثریت ہے تو انہوں نے وہاں فقہ جعفریہ نافذ کر دی۔ ان کے مطابق فقہ جعفریہ کتاب وسنّت کی تعبیر ہے۔ یہی اصول پاکستان میں طے کر لیں۔ یہاں چونکہ اہل سنت کی اکثریت ہے لہٰذا قرآن وسنت کی وہ تعبیر جو اُن کے نزدیک مسلّم ہے‘ اس کو بنیاد بنا کر قوانین بنا لیے جائیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہاں کی عظیم اکثریت حنفی مسلک والوں کی ہے۔ اس صورت میں کتاب وسنت ہی کی بالادستی رہے گی مگر کتاب وسنت سے مسائل اخذ کرنے کے لیے اصول وہ لے لیں جو حنفی مسلک میں ہیں۔ اب نیچے آئیں۔ Law of land تو بنانا پڑے گا۔ چور کے ہاتھ کیسے کاٹے جائیں گے؟ اہل سنت کی رائے الگ ہے اور فقہ جعفریہ کی الگ‘ اور آپ کو ان میں سے ایک رائے اختیار کرنی پڑے گی۔ مختلف مکاتب فکر کے لیے ان کے اپنے بورڈز بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی رائے تھی۔ ان بورڈز میں ان کے اپنے علماء ہوں جو اپنے مکتبہ فکر کے مطابق رہنمائی کریں۔ حتیٰ کہ عدالت بھی بن سکتی ہے جہاں کے جج ان کے اپنے مکتبہ فکر کے مطابق کتاب و سنت کی روشنی میں فیصلے کریں۔ اس حد تک بھی جایا جا سکتا ہے‘ لیکن پورے ملک کے لیے جو قانون سازی ہوگی وہاں اکثریتی مکتبۂ فکر کی رائے کو اختیار کرنا پڑے گا۔ اس ضمن میں ایک رخنہ ہے کہ عائلی معاملات خصوصاً طلاق کے معاملات جب عدالت میں پہنچتے ہیں تو شوہر کہتا ہے کہ میں نے تو ایک ہی طلاق دی ہے۔ بیوی کہتی ہے کہ اس نے تین طلاقیں دی ہیں۔ بیوی حنفی مسلک سے اور شوہر اہلِ حدیث مسلک سے ہو تو پھر کیا ہوگا؟ اس کا سادہ سا حل یہ ہے کہ ایسے مسائل کو نکاح کے مواقع پر طے کیا جا سکتا ہے کہ خدانخواستہ ایسا کوئی مسئلہ آیا تو اس کا فیصلہ کس مکتبۂ فکر کے مطابق طے کیا جائے گا۔ یہ کوئی انہونی سی بات نہیں بلکہ قابل عمل ہے۔

اگلی بات یہ ہے کہ نظام کس طرز کا ہوگا؟ صدارتی ہوگا جس میں صدر کے پاس اصل اختیارات ہوتے ہیں یا پارلیمانی نظام ہوگا جو ہمارے ملک میں رائج ہے؟ جس میں ایک طرف پارلیمنٹ میں وزیراعظم سربراہ مملکت ہے‘ جبکہ دوسری طرف صدر سربراہ ریاست ہے جو برائے نام

ہے۔ اختیارات اس کے پاس کوئی نہیں ہوتے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کا تجزیہ یہ تھا کہ ہم چونکہ انگریز کے غلام رہے ہیں‘ لہٰذا بھارت نے بھی یہی نظام اختیار کیا اور ہم نے بھی یہی نظام اختیار کیا۔ برطانوی نظام میں ملکہ کو پھول کی طرح سجا رکھا ہے۔ ایک طرف پارلیمنٹ موجود ہے اور دوسری طرف ملکہ بیٹھی ہوئی ہے‘ لیکن اس کا معاملہ برائے نام ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی رائے یہ ہے کہ صدارتی نظام خلافت راشدہ سے زیادہ قریب ہے۔ سب سے اوپر ایک بااختیار فرد ہونا چاہیے۔ اس میں بہت ساری سہولتیں ہیں۔ ہم چار صوبے بنائے بیٹھے ہیں۔ افغانستان جیسے چھوٹے سے ملک میں پچاس سے زیادہ صوبے ہیں۔ اگر ہم اٹھارہ کروڑ کی آبادی میں ۱۸ صوبے بنا دیں تو اس میں کیا حرج ہے؟ شوریٰ بنائی جائے۔ امریکہ میں صدر کانگریس کا پابند نہیں ہوتا۔ وہاں کا صدر بڑا بااختیار صدر ہوتا ہے۔ دنیا تمدنی ارتقاء کے نتیجے میں یہاں تک پہنچ چکی ہے‘ لیکن ہمارے ہاں جو بھی پارلیمانی نظام موجود ہے‘ اس میں صدر کی حیثیت محض ربر سٹیمپ کی ہے۔ صدر پورے ملک سے میرٹ کی بنیاد پر لوگوں کو مقرر کرے۔ طرزِ حکومت چاہے صدارتی ہو‘ پارلیمانی‘ وفاقی ہو یا یونیٹری ہو‘ ٹاپ پر قرآن وسنت کی بالادستی طے کر دی جائے۔ شوریٰ مشورے کے لیے موجود ہو۔ شوریٰ قرآن وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے تمام معاملات چلائے اور اس سے تجاوز نہ کرے۔

اگلی بات یہ کہ خواتین کا کردار کیا ہوگا؟ اس پر تو امت کے تمام مکاتب فکر کا اتفاق ہے کہ کوئی خاتون خلیفہ نہیں ہو سکتی مگر مشورے میں شامل ہو سکتی ہے۔ کس کس سطح پر اس کی شمولیت ہو سکتی ہے‘ یہ ستر وحجاب کے حوالے سے دیکھ لیا جائے۔ شوریٰ یا خلیفہ کے لیے خاتون ووٹ دے سکتی ہے‘ لیکن اس کے لیے پولنگ بوتھ الگ بنیں گے۔ وہ شوریٰ کی رکن بن سکتی ہے یا نہیں‘ اس پر بات ہو سکتی ہے۔ یہ ساری باتیں باہمی مشوروں سے طے کی جا سکتی ہیں۔ جیسا کہ ماقبل بیان ہوا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ایک ضعیف عورت نے آپؓ کی رائے کو چیلنج کر دیا تو اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خواتین کو مشوروں میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ مشورے کی ایک اور مثال سنیے۔ صلح حدیبیہ کا موقع ہے۔ ۱۴۰۰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عمرے سے روک دیا گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ احرام کھول دو‘ لیکن انہوں نے نہیں کھولا۔ آپﷺ نے اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے مشورہ لیا۔ انہوں نے کہا کہ آپﷺ احرام کھول دیں تو سب احرام کھول دیں گے۔ آپ سوچیں کہ حضرت ابوبکر‘ حضرت عمر فاروق‘ حضرت عثمان غنی اور حضرت علی رضی اللہ عنہم بھی وہاں موجود تھے‘ لیکن مشورہ ایک خاتون سے ہوا اور اس مشورے پر عمل بھی ہوا اور سارے صحابہ کرامؓ نے احرام کھول دیے۔ تو یہ کردار بھی خواتین کا نظامِ خلافت میں ہو سکتا ہے۔

اگلی بات غیر مسلموں کے حوالے سے ہے۔ غیر مسلم اسلامی ریاست کا شہری ہو سکتا ہے

بشرطیکہ خلافت کی بالادستی کو قبول کرے۔ وہ ذمی بن کر رہے گا‘ لیکن یاد رکھیے کہ ذمی کوئی گالی نہیں ہے۔ وہ ریاست کو جزیہ دے گا اور ریاست اس کے عقیدے‘ جان ومال‘ عزت وآبرو اور اس کی عبادت گاہ کی ذمہ دار ہوگی۔ اس سے جبراً اسلام قبول نہیں کروایا جائے گا۔ وہ اپنے عقائد کی تبلیغ اپنے ہم مذہبوں میں کر سکتا ہے‘ لیکن اسے اس کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ کھلے عام اپنے عقائد کی تبلیغ کرے‘ کیونکہ اسلامی ریاست ایک نظریاتی ریاست ہوتی ہے‘ کسی کو اس کے نظریے کے خلاف بات کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ آپ کی تبلیغی جماعتیں امریکہ اور برطانیہ میں جاتی ہیں اور وہاں تبلیغ کرتی ہیں اور آپ ہمیں یہاں اپنے مذہب کی تبلیغ سے روکتے ہیں۔ بیشک انہیں روکا جائے گا۔ اگر افغانستان میں ایک اسلامی امارت قائم ہوئی تو وہ اسلامی نظریکی بنیاد پر ہوئی‘ لیکن امریکہ کے دستور میں عیسائیت کو ریاست کی بنیاد قرار نہیں دیا گیا۔ اگر آج وہ ایسا کر لے تو اسے ہمیں روکنے کا حق ہوگا۔ اُس دور میں بھی جب مسلمانوں میں خانہ جنگی کی کیفیت تھی‘ وہ باشندے جو عالم اسلام میں ذمی بن کر رہتے تھے‘ انہوں نے بغاوت نہیں کی‘ کیونکہ انہیں اس بات کا اعتراف تھا کہ جو حقوق انہیں اسلامی ریاست میں حاصل ہیں وہ انہیں ان کے اپنے لوگ بھی نہیں دے سکتے۔ حد یہ ہے کہ کبھی خانہ جنگی کی وجہ سے کوئی مسلمان حکمران ذمیوں کو ان کے حقوق ادا نہ کر پائے تو ان حالات میں جو جزیہ وصول ہوا تھا وہ انہیں واپس کر دیا گیا۔

آخری بات یہ ہے کہ ذمہ داروں کا احتساب یقیناً ہوگا۔ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے عاملین سے دریافت فرمایا کرتے تھے کہ ہم نے تمہیں ذمہ داری دی ہے تو بتاؤ کہ تمہارے اثاثے کیا کیا ہیں؟ جب اس عامل کی ذمہ داری ختم ہوتی تھی تو اُس وقت پھر دیکھا جاتا تھا کہ اس کے اثاثے کیا کیا ہیں۔ شوریٰ کے ارکان سمیت تمام ذمہ داران کا محاسبہ ہوگا۔ وقت کے خلیفہ کا بھی احتساب ہوگا۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے سامنے کھڑے ہوئے اور کہا کہ نہ آپ کی بات سنیں گے اور نہ مانیں گے۔ سوال ہوا: کیوں نہیں سنو گے؟ سلمان فارسی نے فرمایا کہ مالِ غنیمت سے جو کپڑا ملا تھا اس سے آپ کا لباس نہیں بن سکتا تھا‘ یہ لباس آپ نے کیسے بنا لیا؟ سیدنا عمر فاروقؓ نے اپنے صاحبزادے سے کہا کہ آپ بتائیں! انہوں نے کہا کہ میں نے اپنے حصے کا کپڑا ابا جان کو دے دیا تھا‘ انہوں نے اپنے حصے کے کپڑے کے ساتھ ملا کر یہ لباس تیار کروایا ہے۔ حضرت سلمانؓ کہتے ہیں کہ ہاں اب ہم آپ کی بات سنیں گے بھی اور مانیں گے بھی!

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو باتیں خیر کی بیان ہوئی ہوں‘ انہیں ہمارے ذہنوں میں بٹھائے اور اس آئیڈیل تک پہنچنے کے لیے جدوجہد کی توفیق عطا فرمائے اور اگر زبان سے کوئی بات خلافِ حق نکلی ہو تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائے اور ہمارے ذہنوں سے اسے محو فرما دے۔ آمین!

❁❁❁

Oct. 2016
Vol. 65

Regd. CPL No. 115
No.10

Monthly **Meesaq** Lahore

سانحۂ کربلا
شہیدِ مظلوم رض

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی
عزیمت وعظمت کی صحیح تصویر

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے
مناقب اور آپ کی مظلومانہ
شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہد صدیقیؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا، آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنا دیا تھا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانیؓ ابولولو فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں۔
- علی مرتضیٰؓ کی طرح حضرت حسینؓ بھی قاتلینِ عثمانؓ کی سازش کا شکار ہوئے۔
- سید الشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لئے

بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں

کا مطالعہ کیجئے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت
اشاعت خاص 90 روپے اشاعت عام 60 روپے
(علاوہ ڈاک خرچ)

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور فون: 3-35869501
email:maktaba@tanzeem.org